www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

June 2006 • No. 355

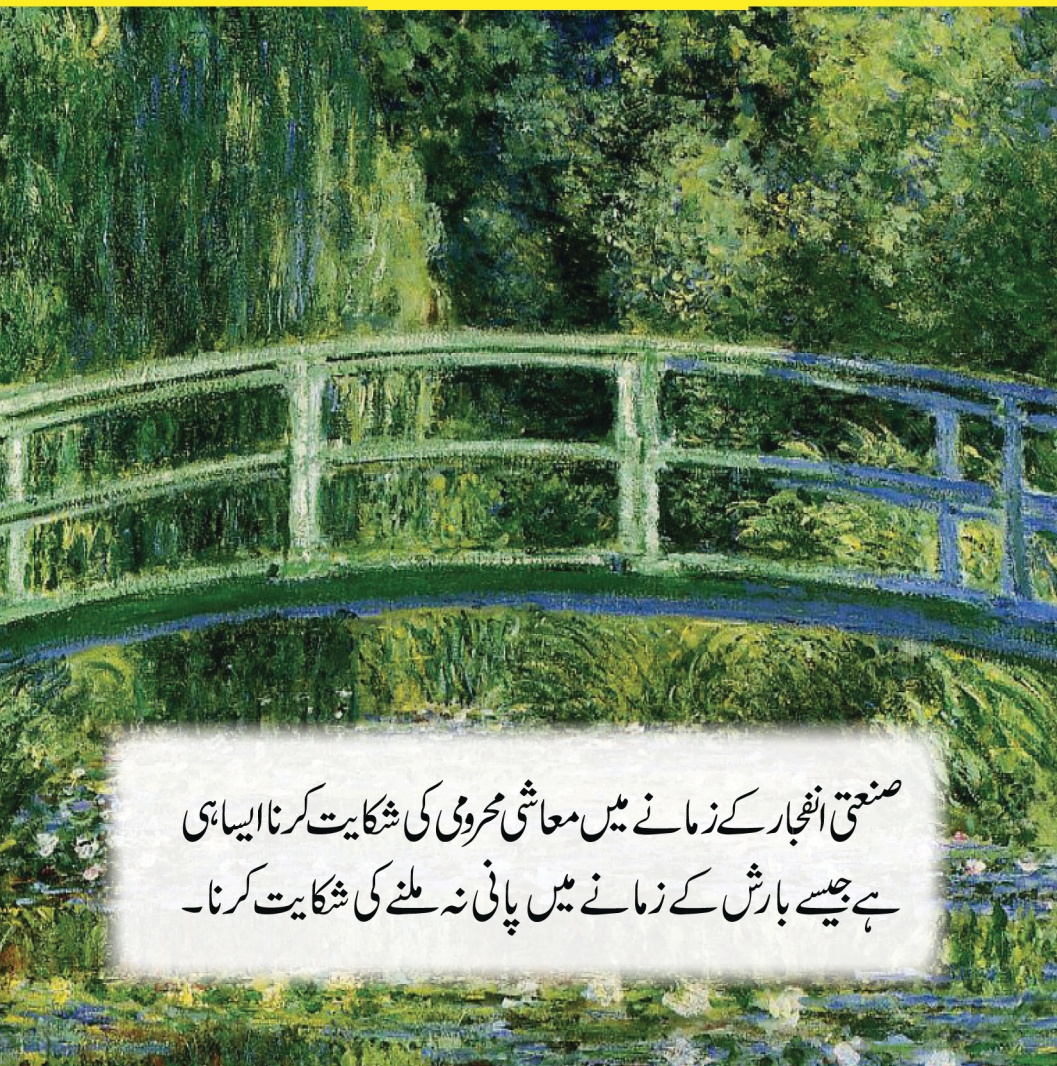

صنعتی انفجار کے زمانے میں معاشی محرومی کی شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسے بارش کے زمانے میں پانی نہ ملنے کی شکایت کرنا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

جون 2006

مہاراشٹر کا سفر

New Release!

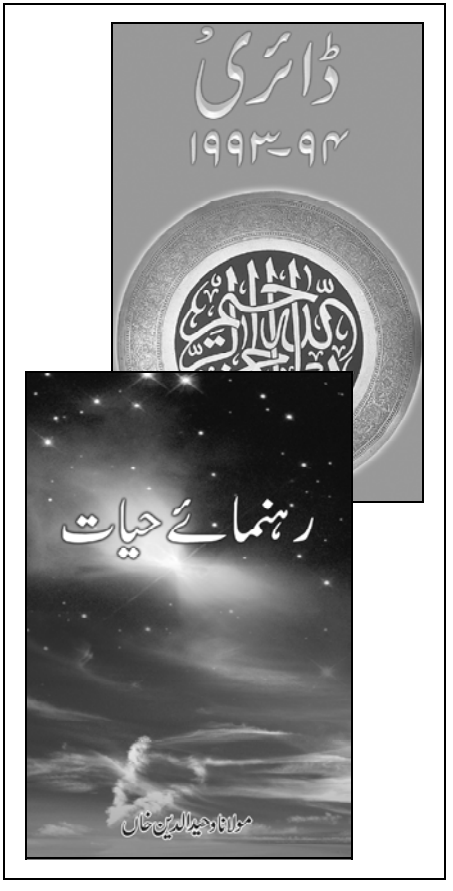

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-13
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

مہاراشٹر کا سفر

واردھا ایک تاریخی شہر ہے جو مہاراشٹر میں ناگپور کے پاس واقع ہے۔ یہاں گوپوری کے علاقے میں ہائر اسٹڈیز کا ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے: انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز۔ یہاں جنوری ۲۰۰۶ کے آخری ہفتے میں ایک سیمینار ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ ہر نمائندے کو پورے ایک دن کا وقت دیا گیا تاکہ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات سے سامعین کو آگاہ کرے۔

اس کی صورت یہ تھی کہ پہلے مقرر اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف پیش کرتا اور اس کے بعد سامعین کی طرف سے سوالات کیے جاتے۔ اس سیمینار میں مجھ کو مدعو کیا گیا تھا تاکہ میں لوگوں کو اسلام سے متعارف کراؤں، خصوصاً اسلام کے روحانیت کے پہلو کے بارے میں۔ اس پروگرام کے تحت، مہاراشٹر کا ایک سفر پیش آیا۔ ۲۴ جنوری ۲۰۰۶ کی شام کو دہلی سے روانگی ہوئی۔ اور ۲۶ جنوری کی رات کو سفر سے واپسی ہوئی۔

جنوری کے نصف ثانی اور فروری کے نصف اول میں قریبی تاریخوں کے لئے کئی دعوت نامے مجھ کو ملے تھے — پونا، بمبئی، پور بندر، بنگلور، واردھا۔ اتنی جلد جلد کئی سفر کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ اس لیے میں نے صرف واردھا کا انتخاب کیا۔ اس سلسلے میں یہ سفر پیش آیا۔

پونا میں ایک عالمی امن کانفرنس (World Peace Conference 2006) ہوئی۔ یہ کانفرنس ۳۰ جنوری سے ۳ فروری تک جاری رہی۔ اس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۷۰۰ نمائندے شریک ہوئے۔

عالمی امن کے موضوع پر ہونے والی اس کانفرنس کا اہتمام حسب ذیل دو بڑی تنظیموں نے کیا تھا:

World Peace Centre, Maeer's MIT, Pune

India International Multivarsity, Pune

یہ کانفرنس یونسکو(UNESCO) کی ۶۰ویں سالگرہ کے موقع پر کی گئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھ کو اس کا دعوت نامہ مورخہ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۵ موصول ہوا جس میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Vision of UNESCO for the 21st century— Education for Peace and Sustainable Development.

اس دعوت نامے کے بعد ان کی طرف سے کئی ٹیلی فون آئے مگر میں اس میں شرکت کا فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ انھوں نے خود سے ائر سہارا (Air Sahara) کے دو رٹرن ٹکٹ بھی بھیج دئے۔ ایک میرے لئے اور ایک میرے ساتھی کے لئے۔ مگر میں بعض وجوہ سے اس میں شرکت کا پروگرام نہ بنا سکا۔ آخر کار ۲۴ جنوری کو ان کا ٹکٹ بذریعہ ڈاک واپس بھیج دیا گیا۔

۲۴ جنوری کو جب میں سفر پر روانہ ہوا تو حج کے موقع پر ۱۲ جنوری ۲۰۰۶ کو پیش آنے والے واقعے کا چرچا ابھی تک جاری تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے ۱۲ جنوری کو رَمیٔ جمرات (شیطان کو کنکر مارنے) کے موقع پر وہاں بھگدڑ ہوئی اور اس میں دب کر ۳۶۲ آدمی مر گئے۔ شیطان کو علامتی طور پر مارنے کے جوش میں لوگوں نے انسان کو حقیقی طور پر مار ڈالا۔

اس قسم کا حادثہ تقریباً ہر سال پیش آتا ہے۔ جہاں تک میں نے سمجھا ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لوگ ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کرنا نہیں جانتے۔ رمیٔ جمرات کے موقع پر شیطان کو مارنا صرف علامتی سنگ باری (symbolic stoning) کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقی طور پر۔ لیکن فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ خود زندہ شیطان کو مار رہے ہیں۔ اسی بے خبری کا نتیجہ جوش و خروش ہے۔ اگر لوگ شعوری طور پر یہ سمجھیں کہ رمیٔ جمرات کا یہ معاملہ ایک علامتی معاملہ ہے نہ کہ حقیقی معاملہ، اگر لوگ اس فرق کو جانیں تو اس عمل کے وقت ان کے اندر وہ غیر معمولی جوش و خروش نہ پیدا ہو جس کے نتیجے میں مذکورہ قسم کا واقعہ پیش آتا ہے۔

میں نے ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ حدیث میں بعد کے زمانے کے بارے

میں آیا ہے کہ: لم یبق من الاسلام الا اسمہ ۔یعنی امت مسلمہ پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب کہ اس کے اندر اسلام کا صرف نام باقی رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے میں یہ پیشین گوئی پوری ہوچکی ہے۔ آج یہ حال ہے کہ ہر جگہ اسلام کا نام استعمال ہو رہا ہے۔ ہر جگہ اسلام کے نام پر دھوم ہو رہی ہے لیکن حقیقی اسپرٹ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کہیں بھی اسپرٹ والا اسلام موجود نہیں۔ یہ معاملہ اتنا زیادہ بڑھا ہے کہ اب لوگ بے روح فارم ہی کو اسلام سمجھنے لگے ہیں۔

۲۴ جنوری کی سہ پہر کو گھر سے ائرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی۔ اس وقت دہلی میں ابھی کافی سردی تھی۔ محکمۂ موسمیات کی اطلاع کے مطابق، دہلی میں اس سال جو سردی پڑی وہ پچھلے ستر سال میں سب سے زیادہ تھی۔ چنانچہ دہلی میں رات کا درجۂ حرارت زیرو پوائنٹ تک پہنچ گیا۔ سردی کا موسم انسان کے لئے بے حد سخت ہے چنانچہ سینکڑوں لوگ اس موسم میں ٹھٹھر کر مر گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے قومِ عاد کے انکار پر اس کو سخت عذاب میں ہلاک کر دیا۔ اس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: إنّا أرسلنا علیھم ریحاً صرصراً فی یوم نحس مستمرّ (القمر: ۱۹-۱۸) دوسری جگہ ایّامِ نحسات (حم السجدہ: ۱۶) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس آیت کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ منحوس دنوں میں انھیں عذاب دیا گیا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ انھیں سخت سردی کے موسم میں عذاب دیا گیا۔ ان کے علاقے میں سردی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس میں گھر کر وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔ یومِ نحس کا یہ مفہوم لسان العرب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (جلد ۶، صفحہ ۲۲۷)

روانگی کے دن میری ملاقات مولانا محمد ذکوان ندوی سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی کا خط دکھایا۔ یہ خط راقم الحروف کے بارے میں تھا۔ اس خط کا پورا مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے:

'بندے کو آپ کے توسط سے حضرت مولانا وحید الدین خاں صاحب سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔ یہ موقع بندے کے لئے ایک انقلابی موقع ثابت ہوا کیوں کہ میری سوچ یہ ہے کہ اگر خدا سے ملنا ہے تو علماء کی صحبت اختیار کی جائے۔ لہذا میں عالیجناب سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوا اور میری خوشیوں میں مزید اضافہ جب ہوا کہ جب میں نے

حضرت والا کی عطا کردہ گراں قدر کتاب ''رازِ حیات'' کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب نے جیسا کہ اپنے نام ہی سے ظاہر ہے میرے قلب کو منور و مجلّی کر دیا۔ کیوں کہ میں ابھی تک جس دائرے میں رہ کر زندگی گذار رہا تھا اس میں مجھ کو صرف اور صرف ناامیدیاں ہی ناامیدیاں نظر آرہی تھیں، بلندیوں کی طرف توجہ ہی نہ ہو پاتی تھی جس سے آئندہ زندگی تاریک نظر آنے لگی تھی لیکن ''رازِ حیات'' کو پڑھ کر میں کچھ اس طرح متاثر ہو رہا ہوں کہ اب مستقبل مجھے آفتاب اور ماہتاب کی طرح روشن نظر آتا ہے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ میری نسبت حضرتِ والا سے مستقل طور پر جُڑ جائے اس کے لیے حضرت والا کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ (۱۵ جنوری ۲۰۰۶، حافظ شمس الحق، ایم۔اے، گونڈہ)

دارالعلوم دیوبند (وقف) کے تحت، ۲۴، ۲۵، ۲۶ مئی ۲۰۰۶ کو قاری محمد طیب صاحب کے اوپر ایک عالمی سیمینار ہونے والا ہے۔ اس کی ایک پیشگی رپورٹ نئی دہلی کے روزنامہ راشٹریہ سہارا ۲۳ جنوری ۲۰۰۶ میں نظر سے گذری۔ دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے دیوبند میں ہونے والی ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ — دارالعلوم تحریک امن وسلامتی، انسان دوستی اور عدم تشدّد کے فلسفے کی پیام بَر ہے۔ (صفحہ: ۴)

یہ ایک خلافِ واقعہ بات ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ادارہ انگریزوں کے خلاف مسلّح جہاد کی تحریک کے ضمن میں قائم ہوا۔ بوقتِ قیام، اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کے لیے مجاہد تیار کیے جائیں۔ دیوبندی علماء نے اس زمانے میں فتویٰ دیا تھا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے، اور انگریزوں کے خلاف مسلّح جہاد مسلمانوں کا فریضہ ہے۔

اس جلو میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا۔ چنانچہ اس کے بڑے بڑے علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ باقاعدہ طور پر انگریز مخالف جہاد میں شریک رہے۔ یہ حقیقت سوانحِ قاسمی (مولانا مناظر احسن گیلانی) اور علماءِ ہند کا شاندار ماضی (مولانا محمد میاں) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

غیر متشددانہ پالیسی بلاشبہہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر مذکورہ بیان تاریخی اعتبار سے درست نہیں۔ اس قسم کا بیان ایک غلط ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی ماضی کی غلطی کا اعتراف نہ کرتے ہوئے حال کی پسندیدہ بولی بولنا۔ مولانا موصوف کے لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ صاف طور پر یہ اعلان کریں کہ ماضی کے علماء کا یہ اقدام غلط تھا کہ انھوں نے ہندستان کو دارالحرب قرار دیا، اور انگریزوں کے خلاف مسلّح جہاد کا فتویٰ دیا۔ اِس اعلان کے بعد وہ کہتے کہ اب ہم اِس غلطی کی تصحیح کرتے ہیں، اور ازسرِ نو صحیح پالیسی اختیار کرتے ہیں۔

غلطی کا اعتراف کیے بغیر اپنے موقف کو بدلنا، ایک سنگین جرم ہے۔ اِسی سے کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ لوگ صحیح انداز میں سوچنے کے قابل نہیں بنتے۔ صحتِ فکر کی لازمی شرط ہے — پچھلی غلطی کا اعتراف۔ غلطی کا اعتراف کیے بغیر خاموشی سے اپنا موقف بدل لینا، یہ موجودہ زمانے میں عام ہو چکا ہے۔ مذہبی لوگ اور سیکولر لوگ دونوں ہی اِس روش میں مبتلا ہیں۔ ایسا کرکے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی پوزیشن کو محفوظ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے انعام سے محروم کر رہے ہیں، اور وہ ہے حقیقت واقعہ کا اعتراف، اور ذہنی ارتقاء۔

دہلی ائر پورٹ پر ٹائم میگزین کا شمارہ ۲۳ جنوری ۲۰۰۶ دیکھنے کو ملا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان یہ تھا:

The Case for Doing One Thing at a Time.

یہ ایک امریکی خاتون ہیں جن کا نام ہے سوزے آرمن (Suze Orman) یہ خاتون امریکا کی نمبر ایک فائننشل ایڈوائزر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کو یہ غیر معمولی مقام کیسے ملا۔ اس کا راز مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کرتی ہیں۔ وہ شدت سے اپنے اس اصول پر کاربند ہیں:

Financial advisor, Suze Orman refuses
to be interrupted while on task.

وہ تنہا ہیں، انھوں نے شادی نہیں کی۔ حتی کہ ان کا کوئی سرونٹ یا مددگار بھی نہیں۔ وہ کسی

بھی قیمت پر (distraction) کو برداشت نہیں کرتیں۔ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران اپنے بارے میں کہا:

When I am writing, I don't answer phones.
I don't care what else is going on. (p. 37)

دہلی ائرپورٹ پر ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے۔ ان کا نام نیرج جین تھا۔ وہ ایک کمپیوٹر کمپنی میں چیف ایگزیکیٹیو آفیسر تھے۔ انھوں نے میرے ساتھی سے میرے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اسپرچول گرو ہیں۔ انھوں نے دلچسپی ظاہر کی تو انھیں انگریزی کے چند پمفلٹ دئے گئے جو CPS کے تحت چھاپے گئے ہیں۔ ان کتابچوں کے نام یہ ہیں:

The Reality of Man
Man and God
Destination of Man

موجودہ زمانے میں دعوہ ورک کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں سفر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اب لوگوں کے درمیان بہت زیادہ انٹریکشن ہونے لگا۔ یہ انٹریکشن دعوہ ورک کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔ اگر لوگ اپنے بیگ میں دعوتی موضوعات پر کتابچے رکھ لیں اور ملاقات کے وقت لوگوں کو دیتے رہیں تو موثر دعوتی کام ہوسکتا ہے۔

ایرپورٹ کے اندر پہنچا تو وِنڈو پر بیٹھی ہوئی خاتون نے بتایا کہ جہاز ٹھیک وقت پر دہلی سے روانہ ہوگا۔ مگر عملاً ایک گھنٹے سے زیادہ تاخیر کے ساتھ جہاز کی روانگی ہوئی۔ سنگاپور کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ سنگاپور میں ٹائم کی سخت پابندی کی جاتی ہے۔ وہاں جہاز ٹھیک وقت پر روانہ ہوتا ہے اور ٹھیک وقت پر اترتا ہے۔ انڈیا میں لوگ ٹائم کا نشش نہیں۔ مزید یہ کہ انڈیا کے ائرپورٹ پر ابھی تک ماڈرن سہولتیں موجود نہیں، حتی کہ دہلی ایرپورٹ میں بھی نہیں۔ ایرپورٹ کو جب تک عالمی معیار کے مطابق نہ بنایا جائے اِس قسم کے مسائل جاری رہیں گے۔

جہاز کے اندر داخل ہوا تو وہاں مطالعے کے لیے اخبارات موجود تھے۔ ۲۴ جنوری ۲۰۰۶ کے ٹائمس آف انڈیا میں کچھ سبق آموز خبریں تھیں ایک خبر یہ تھی کہ فلم اسٹار امیتابھ بچن

بہت بڑی رقم ایک مندر کو نذرانے میں دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں خبر کے الفاظ یہ تھے:

Bachchan refuses to comment on the news report that he is donating jewellery worth Rs. 10 crore to the Trupati Temple. I don't like my religious activities to be made public.

اِس خبر پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ہر انسان کے اندر یہ جذبہ چھپا ہوا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے بڑا ہے۔ اپنے لیے ایک بڑے کو پانے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ جذبہ حقیقتاً خدائے برتر کے لیے ہے۔ لیکن خدا کو نہ پانے کی صورت میں وہ اپنے اِن احساسات کو کسی غیر خدا کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

ہر ایرپورٹ پر سیکورٹی چیک کا ایک مسئلہ ہوتا ہے، وہ دہلی ایرپورٹ پر بھی پیش آیا۔ ایک اخبار میں یہ خبر تھی کہ سیکورٹی چیک ہر مسافر کے لیے ضروری ہے۔ ایرپورٹ کے کئی مرحلے میں ہر مسافر کی پوری چیکنگ کی جاتی ہے۔ مگر ملکی قانون کے مطابق، کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شہری پرواز کی وزارت کے تحت، سیکورٹی کٹیگری کمیٹی (Security Category Committee) ہے۔ اس نے کچھ شخصیتوں کو سیکورٹی چیک سے مستثنیٰ قرار دیا ہے — پریسیڈنٹ، پرائم منسٹر، سابق پرائم منسٹر اور سابق پریسیڈنٹ، چیف جسٹس آف انڈیا، اور دلائی لاما۔ یہ طریقہ صرف انڈیا میں ہے۔ باہر کے ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کے امتیازی طریقے موجود نہیں:

Throughout the world the airport security checks are being tightened. So much so that even former US vice presedent Al Gore had to take off his shoes for a security check, post 9/11.

جیٹ ایرویز کا فلائٹ میگزین جیٹ ونگس (Jetwings) کا شمارہ جنوری ۲۰۰۶ جہاز کے اندر برائے مطالعہ موجود تھا۔ ۲۸۸ صفحے کا یہ میگزین آرٹ پیپر پر چھپا ہوا تھا۔ ہر صفحے پر خوب صورت رنگین تصویریں تھیں۔ لیکن پورے میگزین میں کوئی ایسی بامعنیٰ بات نہیں ملی جو سفرنامے میں قابلِ ذکر ہو۔ اکثر فلائٹ میگزین ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر صرف دو چیزیں شائع کی جاتی ہیں — اشتہار یا تفریحی مضامین۔

تاہم یہ کوئی استثنائی بات نہیں۔ اکثر لوگ جو جرائد کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ ان سے میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس میں کوئی بامعنی بات پڑھی ہو تو بتائیے۔ لیکن میرے تجربے کے مطابق، ننانوے فیصد لوگ کوئی نصیحت کی بات یا کوئی معنی خیز بات بتا نہیں پاتے۔ تقریباً ہر زبان کا معاملہ یہی ہے۔ ایک صاحب جو ایک اردو ماہ نامہ کے خریدار ہیں اور دس سال سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اِس پوری مدت میں کوئی سبق کی بات پڑھی ہو تو وہ بتائیے۔ وہ ایک بات بھی نہ بتا سکے۔

گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ صرف رسائل اور جرائد کی اپنی حالت کا بیان نہیں ہے بلکہ وہ اُن لکھنے والے دانش وروں کی فکری حالت کا بیان ہے جو ان کو مرتب کرتے ہیں اور انھیں شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کی اکثریت کا معاملہ ٹھیک وہی ہے جو ایک فارسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اوخویشتن گُم است کرا رہبری کُند

سفر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ماہ نامہ کے ایڈیٹر تھے۔ ان سے گفتگو شروع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی مثبت بات نہیں ہے۔ ان کے پاس یا تو اپنے مفروضہ اکابر کی تعریفیں تھیں یا مفروضہ دشمنوں کی شکایتیں۔ اِس قسم کی سوچ میرے نزدیک منفی سوچ ہے، اور منفی سوچ کا آدمی، کوئی بامعنٰی نصیحت کی بات نہیں سوچ پاتا۔ بامعنٰی نصیحت ہمیشہ مثبت ذہن سے نکلتی ہے۔ منفی ذہن اور مثبت پیغام دونوں ایک انسان کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں۔

ایڈیٹر صاحب سے گفتگو کے دوران محسوس ہوا کہ وہ مثبت کلام اور منفی کلام کا فرق نہیں سمجھتے۔ مثلاً وہ ادبی انداز کی تعریفی تحریروں کو مثبت تحریر سمجھتے تھے، اور تجزیاتی تنقید کو منفی تحریر کا درجہ دیتے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ خیال درست نہیں۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ کسی مضمون کو پڑھ کر قاری کو اپنے لیے کوئی تعمیری پیغام ملا یا نہیں۔ مثبت انداز دراصل تعمیری انداز ہے، اور منفی انداز وہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں تخریبی انداز کہا جا سکتا ہے۔

مثلاً اگر آپ اپنی ایک محبوب شخصیت کے بارے میں لکھیں کہ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔

ان کی تحریروں نے ایک نیا عہد پیدا کیا۔ انھوں نے وقت کے ظالموں کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ وہ اپنے زمانے کے تمام اہل قلم میں ایوریسٹ کی چوٹی پر نظر آتے تھے، وغیرہ۔ اِس طرح کے الفاظ پڑھ کر کسی قاری کو اپنی زندگی کے لیے کوئی تعمیری پیغام نہیں ملتا۔ اس لیے میں اس کو منفی ادب میں شمار کروں گا۔

اس کے برعکس، اگر ایک شخص تجزیاتی تنقید کا طریقہ اختیار کرے۔ مثلاً وہ اقبال کے اِس شعر کا حوالہ دے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پے آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

وہ لکھے کہ اِس شعر میں مغربی تہذیب کو خنجر کہا گیا ہے۔ حالاں کہ مغربی تہذیب علومِ فطرت کی تحقیق کا پیغام دیتی ہے۔ یہ بظاہر ایک تنقید ہے لیکن وہ مثبت نتیجے کی حامل ہے۔ کیوں کہ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قاری، مغربی تہذیب سے نفرت کو چھوڑے گا اور اس سے مثبت فائدہ اٹھا کر علومِ فطرت کو حاصل کرے گا جو موجودہ زمانے میں ترقی کے لیے ضروری ہے۔

تنقید کے معاملے میں رائے قائم کرنے کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس کے انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ جو تنقید قاری کو صرف نفرت اور غصّے کا تحفہ دے وہ تخریبی تنقید ہے، اِس کے برعکس، جو تنقید قاری کو اصلاحِ حال کا سبق دے وہ تعمیری تنقید ہے۔ اور وہ مطلوب تحریر کا درجہ رکھتی ہے۔

دہلی سے ناگپور کا سفر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ناگپور ایرپورٹ پر مسٹر عبدالسلام اکبانی، جسٹس ایم۔ ایم۔ قاضی اور مسٹر زبیر احمد اکبانی موجود تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو کر مسٹر عبدالسلام اکبانی کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ یہاں رات گذار کر صبح سویرے مجھے بذریعہ کار واردھا جانا تھا۔

رات کو ناگپور میں قیام رہا۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ کی صبح کو فجر کی نماز ناگپور میں پڑھی۔ اس کے بعد بذریعے کار ناگپور سے واردھا کے لیے روانگی ہوئی۔ صبح کے سُہانے وقت میں سفر کرنا گویا فطرت کی دنیا میں سفر کرنا ہوتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ سفر اسی قسم کا ایک سفر تھا۔ راستے میں سڑک کے دونوں طرف

فطرت کی دنیا تھی جو صبح کی روشنی میں چمک اٹھی تھی۔ کُھلا آسمان، کھلی روشنی، درختوں اور کھیتوں کے مناظر، چڑیوں کی آوازیں، اِس طرح کے ماحول میں یہ سفر طے ہوتا رہا۔ سڑک زیادہ اچھی نہ تھی تاہم فطرت کا مشاہدہ اِس کمی کے احساس پر غالب آ گیا۔

فطرت اور انسانی تمدن میں فرق پر غور کرتے ہوئے میں نے کہا کہ فطرت کا خالق کتنا عظیم ہے جس نے ایک عظیم کائنات اس طرح بنائی کہ اس کو دوبارہ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے مقابلے میں انسان ایک متمدن دنیا کی تعمیر کرتا ہے اور اس میں بار بار نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ یہ فرق بلاشبہہ قادرِ مطلق کے وجود کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد واردھا پہنچا۔ یہاں گوپوری کے علاقے میں ایک بڑے رقبے میں ایک ادارہ قائم ہے جس کا نام یہ ہے — انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز۔ ادارے کے قیام کے لیے یہ زمین جمنا لال بجاج نے دی تھی جو کہ گاندھی سے بہت متاثر تھے۔ یہاں صبح کی چائے کے ساتھ مقامی منتظمین سے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد مجھ کو ادارے کے ہال میں لے جایا گیا جہاں سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔

چائے کی اس نشست کے دوران ایک صاحب نے اسلام میں نظرِ ثانی (revision) کی بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں آیا تھا۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اور اسلام کو آج کے لحاظ سے ریلیوینٹ (relevant) بنانے کے لیے اسلام میں نظرِ ثانی اور ریفارم کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ موجودہ زمانے میں بار بار اٹھایا گیا ہے۔ اپنے مطالعے اور غور وفکر کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ معاملہ اسلام میں ریفارم یا نظرِ ثانی کا نہیں ہے بلکہ بعد کے زمانے میں اسلام پر پڑے ہوئے غبار کو ہٹانے کا مسئلہ ہے۔ ایک ماڈرن رائٹر نے کہا ہے کہ قرآن کو پھر سے نازل ہونا چاہیے:

Qur'an has to be re-revealed today.

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں۔ قرآن آج بھی پوری طرح ریلیوینٹ (relevant) ہے۔

مسئلہ صرف بعد کو پیدا ہونے والے نظریات کا ہے جو اسلام کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم اِن پَردوں کو ہٹائیں اور اسلام کو دوبارہ اس کی اصل صورت میں جان سکیں۔ اس لیے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ قرآن کو پھر سے دریافت کرنے کی ضرورت ہے:

Qur'an has to be re-discovered today.

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک، وہ جو روایت پسند ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کو کرانت کاری (انقلابی) کہا جاتا ہے۔ روایت پسند آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جس ماحول میں یا جن حالات میں رہتا ہے اس کے لحاظ سے اس کا ایک مزاج بن جاتا ہے۔ اس مزاج کے تحت، وہ اپنی ایک پُر عافیت زندگی بنالیتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو ایک محفوظ طریقہ سمجھتا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں زیادہ غور وفکر نہ کرے بلکہ حالات کے تحت، اس کا جو ذہن بن گیا ہے اس پر مطمئن ہو کر آسودگی کی زندگی گذارتا رہے۔

کرانت کاری انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو عقلی طور پر سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ ہر چیز کی معقولیت کو جاننا چاہتا ہے۔ روایت پرست انسان اگر اپنی عقل کو معطّل کر لیتا ہے تو کرانت کاری انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ وہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتا جب تک وہ عقلی طور پر اس کے لیے قابلِ فہم نہ بن جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو معرفت کے اعلیٰ درجے حاصل ہوتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز میں ایک خوبصورت ہال ہے۔ یہ ہال چاروں طرف سے کھلا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف درختوں کا منظر ہے اور چڑیوں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ اس ہال میں سیمینار کا آغاز ہوا۔ حاضرین میں زیادہ تر نوجوان لوگ تھے۔ کچھ خواتین بھی اس میں شامل تھیں۔ پہلے ادارے کے چیرمین نے ابتدائی خطاب کیا۔ اس میں پروگرام کے بارے میں اور میرے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اس کے بعد میرا خطاب شروع ہوا۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ کا پورا دن مجھے دیا گیا تھا۔ ایک سشن لنچ سے پہلے ہوا، اور اور دوسرا سشن لنچ کے بعد۔ دونوں سشن میں پہلے میری تقریر ہوئی،

اوراس کے بعد سوال اور جواب شروع ہوا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔

میں نے اپنے خطاب میں پہلے اسلام کی اور پیغمبر اسلام کی مختصر تاریخ بیان کی۔ اِس سلسلے میں میں نے کہا کہ اسلام سُپیریر ریلیجن نہیں ہے بلکہ وہ محفوظ (preserved) ریلیجن ہے۔ تمام پیغمبروں کا مذہب ایک ہی تھا، لیکن اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اب بھی اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ ہے۔ اور اسی طرح قرآن کی اصل زبان بھی ایک زندہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ اسلام کی تعلیمات امن، اور روحانیت اور انسانیت کے ابدی اصولوں پر مبنی ہیں۔ اسلام مثبت اندازِ فکر (positive thinking) پیدا کرتا ہے۔ اسلام میں جنگ اور تشدد کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام میں جنگ کی ایک ہی صورت جائز ہے اور وہ دفاعی جنگ ہے۔ خارجی حملے کی صورت میں اسلام میں جنگ کو جائز کیا گیا ہے لیکن یہ جنگ بھی صرف باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کا جنگ کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ غیر حکومتی تنظیموں کے لیے صرف پُر امن جدوجہد ہے۔ اور اگر پُر امن جدوجہد کے مواقع نہ ہوں تو ان پر فرض ہے کہ وہ صبر کریں اور خدا سے دعا کرتے رہیں۔

مذہبی اختلافات کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ اختلافات کو مٹانا ممکن نہیں۔ اس لیے اس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود اتحاد کی راہیں تلاش کی جائیں اور وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ دوسرے مذہبی گروہ کا احترام کرے۔ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے پُر امن انداز میں ڈائلاگ جاری رہنا چاہیے۔ اِس سلسلے میں قرآن اور حدیث کے حوالوں اور صحابہ کے واقعات سے اِس بات کو واضح کیا گیا۔

تقریر کے بعد حاضرین کی طرف سے بہت سے سوالات کیے گیے جن کا جواب دیا گیا۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی تقریر میں نے نہایت غور سے سنی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آج میں نے اسلام کو ری ڈسکور کیا:

Today I have re-discovered Islam.

میں اسلام کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اسلام نفرت اور تشدّد کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر آج معلوم ہوا کہ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ اب میں اسلام کا مزید مطالعہ کروں گا۔ ایک اور تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ کی تقریر سے مجھے اسلام کے مطالعے کا ایک اہم اصول ملا۔ وہ یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کو الگ کرکے دیکھا جائے۔ اسلام کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے وہ اسلام کی اپنی تعلیمات کی روشنی میں ہو نہ کہ مسلمانوں کو یا مسلم سوسائٹی کو دیکھ کر۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم نے سُنا ہے کہ اسلام حُبّ الوطنی کے خلاف ہے۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ مسلمان صرف مکّہ مدینہ سے محبت کرے، اور ملک سے نہیں۔ اپنے ملک سے محبت کرنے کو اسلام میں بُت پرستی کا درجہ دیا گیا ہے۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے اپنے شعر میں اِس قسم کی بات کہی ہے مگر اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے۔ جس طرح ماں سے محبت ایک فطری چیز ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اس لیے وطن کی فطری محبت بھی اسلام کے عین مطابق ہے۔ البتہ وطن کو معبود سمجھنا اور وطن کو پوجنا، یہ اسلام میں نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وطن پرستی کا تصور صرف انڈیا میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں میں حبّ الوطنی کا تصور موجود ہے لیکن وطن پرستی کا تصور انڈیا کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

ایک اور صاحب نے سوال کیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ اسلام میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلمان چار شادیاں کرے اور زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرے۔ میں نے کہا کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت صرف ہنگامی حالات کے لیے ہے وہ کوئی عمومی حکم نہیں۔ جنگ یا کسی حادثے کے موقع پر ایسا ہوتا ہے کہ مَردوں کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور عورتیں سرپلس ہوجاتی ہیں۔ ایسی حالت میں صرف معاشرتی انتظام کے طور پر ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے نظام کے مطابق، عورتوں کی تعداد اور مَردوں کی تعداد ہمیشہ تقریباً برابر برابر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک شوہر اور ایک بیوی کا فارمولا ہی فطری فارمولا ہے۔ البتہ

جب کسی بحران کے نتیجے میں عورتیں سرپلس ہو جائیں تو اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور ایک سے زیادہ شادی اِسی مسئلے کے حل کی ایک تدبیر ہے۔ میں نے کہا کہ جب عورتیں سرپلس ہو جائیں تو ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں معاشرے میں جنسی انارکی پھیل جائے گی۔

ایک خاتون نے سوال کیا کہ اسلام میں عورتوں کو برابر کے حقوق نہیں دیے گیے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورتوں کو دبا کر رکھو۔ میں نے کہا کہ یہ صرف غلط فہمی کی بات ہے۔ یہ غلطی فہمی ایک غلط تقابل کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب میں نسوانی آزادی کا مطلب بے قید آزادی سمجھا جاتا ہے۔ جو آخر کار صنفی انارکی تک پہنچ جاتی ہے۔ لوگ اِس معیار کو لے کر اسلام کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ معیار بذاتِ خود درست نہیں اگر آزادی کو لے کر تقابل کیا جائے تو اسلام میں مکمل آزادی ملے گی۔ لیکن اگر بے قیدی کے تصور کو لے کر تقابل کیا جائے تو بلاشبہہ اِس قسم کی بے قید آزادی اسلام میں نہیں ہے۔

ایک خاتون نے یہ سوال کیا کہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہے۔ اسلام میں عورتوں کا کوئی رول نہیں اس لیے اسلام میں عورتوں کی تعلیم کو بھی پسند نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہ آج کل کی اصطلاح کے مطابق، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ آپ ان کی لائف کو پڑھیں تو آپ کو حیرانی ہوگی کہ انھوں نے کتنے بڑے بڑے کام کیے ہیں اور کتنی اعلیٰ سطح پر اسلام کی نمائندگی کی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اس کا ایک عملی ثبوت خود یہاں بھی موجود ہے۔ میں ایک مذہبی مسلمان ہوں۔ اسلام میرا مشن ہے۔ یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میری لڑکی فریدہ خانم اور میری پوتی سعدیہ یہاں موجود ہیں۔ دونوں نے یہاں اسلام پر انگریزی میں تقریریں کی ہیں۔ کیا تعلیم کے بغیر یہ دونوں یہاں کے پروگرام میں حصہ لے سکتی تھیں۔ میں نے کہا کہ تعلیم زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور جو چیز زندگی کا حصہ ہو وہ یقینی طور پر اسلام کا بھی حصہ ہوگا۔

انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز میں مقررہ پروگرام کے علاوہ بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ اِن لوگوں سے بر بر باتیں ہوتی رہیں۔ ادارے کے ایک رُکن نے میرے ساتھ وارد ھا اور ناگپور کے درمیان سفر بھی کیا۔ ان لوگوں سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔

موجودہ زمانے میں جو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو کھُلا پن (openness) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ لوگ کھُلے طور پر ڈائیلاگ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کہ قدیم زمانے میں لوگ صرف بند ذہن کے تحت سوچنا جانتے تھے۔ اس مزاج نے جو نیے مواقع پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کو جاننا چاہتے ہیں۔ اِس طرح موجودہ زمانے میں پہلی بار ساری دنیا میں ریلجس انڈر اسٹینڈنگ (religious understanding) کا ماحول بنا ہے۔

مجھے خدا کے فضل سے مسلسل اِس جدید امکان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا بڑا تجربہ مجھے اب سے ۴۷ سال پہلے پیش آیا۔ آریہ سماج (سیوہارہ، ضلع بجنور) نے اپنے چونسٹھ سالہ جشن جوبلی کے موقع پر آخر نومبر ۱۹۵۹ میں ایک ہفتہ منایا تھا۔ اِس موقع پر ۲۹ نومبر کو ایک بین مذاہب کانفرنس ہوئی۔ جس میں مختلف مذاہب کے علما نے شریک ہوکر اپنے اپنے مذہب کا تعارف پیش کیا۔ اس موقع پر اسلام کے نمائندے کی حیثیت سے میں نے وہاں ایک مقالہ پیش کیا۔ ۲۴ صفحات کا یہ مقالہ ''اسلام کا تعارف'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

یہ جلسہ اصلاً مذاہب کے درمیان باہمی تعارف کے لیے کیا گیا تھا۔ لیکن لوگوں میں یہ مشہور ہوگیا کہ یہاں مذہبی مناظرہ ہونے والا ہے۔ لوگوں کو مناظرہ (debate) سے خاص دل چسپی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں ہندو اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اکھٹا ہوگئی۔ میں نے مقالے کی صورت میں اپنے خیالات پیش کیے۔ اس جلسے کے صدر بریلی کے ایک ہندو وکیل تھے۔ آخر میں اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ — جن لوگوں نے یہاں تقریر کی ان میں صرف ایک تقریر ایسی تھی جو پوری طرح واضح اور ہر ایک کے لیے قابلِ فہم تھی، اور یہ اسلام کے نمائندے کی تقریر تھی۔

اس قسم کے جلسے آج کل ساری دنیا میں ہورہے ہیں۔ مجھے بار بار اِن جلسوں میں اسلام کی نمائندگی کے لیے بُلایا جاتا ہے، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔ میں ہر جگہ کسی شرط یا تحفظ ذہنی کے بغیر اسلام کی تعلیمات کو پیش کرتا ہوں۔ میرا تجربہ ہے کہ لوگ جب اسلام کی فطری تعلیمات کو سنتے ہیں تو وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

ہم خود بھی اپنے انتظام کے تحت، اِس قسم کے جلسے منعقد کرتے ہیں۔ اس کی ایک باقاعدہ اور منظّم صورت یہ ہے کہ الرسالہ مشن یا CPS کی طرف سے نئی دہلی میں ہفتے وار اجتماع ہر اتوار کو، اسپر یچول کلاس کے نام سے کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جنوری ۲۰۰۱ سے مسلسل طور پر جاری ہے۔ اِس میں ہندو اور مسلمان دونوں طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوتے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف گاندھین اسٹڈیز (واردھا) کا موجودہ سفر بھی اسی قسم کا ایک سفر تھا۔ اس سے پہلے بھی میں یہاں دوبار آچکا ہوں۔ اب یہ تیسری بار یہاں کے پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ یہاں جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان میں ننّانوے فیصد ہندو حضرات تھے۔ یہ سب گاندھیائی خیالات سے متاثر تھے۔ ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو غیر ضروری بحثیں کرے یا معاندانہ قسم کے سوالات پیش کرے۔ یہاں کے سبھی لوگ سنجیدہ اور علمی مزاج رکھنے والے نظر آئے۔

اِس انسٹی ٹیوٹ کے تحت، ایک تعلیمی ادارہ چلایا جارہا ہے۔ یہاں ایک اچھی لائبریری بھی قائم ہے۔ یہاں کا ماحول امن اور رُوحانیت کا ماحول نظر آتا ہے۔ یہاں جن لوگوں سے بھی باتیں ہوئیں انھوں نے بحث وتکرار کا انداز اختیار نہیں کیا بلکہ سنجیدہ انداز میں زیر بحث بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں اِس سلسلے میں چند گفتگوئیں نقل کی جاتی ہیں:

ایک صاحب نے کہا کہ آج کل مسلمان جگہ جگہ خودکُش بمباری (suicide bombing) کررہے ہیں۔ اس کی وجہ سے اسلام ساری دنیا میں بدنام ہورہا ہے۔ آپ خودکش بمباری کے خلاف ایک کتاب لکھیے، جس کا ٹائٹل یہ ہو:

Why suicide bombing is haram in Islam.

یعنی خودکش بمباری اسلام میں کیوں حرام ہے— میں نے کہا کہ اس سے پہلے ایک اور کتاب لکھنے کی ضرورت ہے جس کا نام یہ ہو کہ — نفرت بم کیوں اسلام میں سُپر حرام ہے:

Why hate bombing is super haram in Islam.

میں نے کہا کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خودکُش بمباری کے ذمّے دار صرف چند مسلم نوجوان ہیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خودکش بمباری کے ذمّے دار موجودہ زمانے کے تقریباً سارے ہی مسلمان ہیں۔

اس لیے کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ یہ ہو رہا ہے کہ مسلمان غیر مسلم قوموں کے خلاف ظلم کی داستانیں بیان کرنے میں مشغول ہیں، وہ اِن قوموں کو اسلام اور مسلمان کا دشمن بتا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اخبار، ان کے اجتماعات، ان کی مجلسیں، ان کی کتابیں اور رسالے، حتی کہ ان کی مسجد اور مدرسے ہر جگہ یہی بتایا جا رہا ہے کہ دوسری قومیں ان کی دشمن ہوگئی ہیں۔ ہر ایک ان کے خلاف زیادتی کرنے میں مشغول ہے۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے صرف ایک ہی کام میں مشغول ہیں، وہ ہے غیر مسلم قوموں کی منفی تصویر پیش کرنا، ان کے خلاف شعوری یا غیر شعوری طور پر نفرتی مہم چلانا۔ عرب سے لے کر عجم تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ہر جگہ یہی نفرتی مہم (hate campaign) جاری ہے۔

مسلم ملّت کی یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی وجہ سے مسلم نوجوان دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور غصے میں بھر گیے۔ اسی نفرت اور غصے کا اظہار خودکش بمباری کی صورت میں ہوتا ہے۔

اسی سے اس بات کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں ایسا ہے کہ یہ خودکش بمباری اکثر پڑھے لکھے نوجوان کرتے ہیں نہ کہ جاہل اور غریب مسلمان۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ نفرتی مہم پریس اور میڈیا کی سطح پر چلائی جاتی ہے۔ اور پریس اور میڈیا تک انھیں لوگوں کی پہنچ ہوتی ہے جن کو تعلیم یافتہ مسلمان کہا جاتا ہے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے شیلے کا ذکر کیا اور کہا کہ پی۔ بی۔ شیلے

(Percy Bysshe Shelley) ایک برٹش شاعر تھا۔ وہ ۱۷۹۲ میں پیدا ہوا، اور ۱۸۲۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ — ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ پُر درد نغمے ہیں:

Our sweetest songs are those that tell our saddest thoughts.

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو دردمند زندگی ملتی ہے انھیں کی زبان سے پُر سوز کلام جاری ہوتا ہے۔ پُر راحت اور پُر مسرت زندگی گذرانے والے کبھی پُر سوز کلام کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ اِسی حقیقت کو فانی بدایونی نے اِن الفاظ میں نظم کیا ہے:

زمانہ بَرسرِ آزار تھا مگر فانی تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

جب کسی انسان کو خدا پُر درد زندگی دے تو یہ خدا کی طرف سے اس کے لیے ایک خاموش پیغام ہوتا ہے۔ یہ اِس بات کی علامت ہے کہ خدا اُس انسان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگانا چاہتا ہے۔ خدا اس انسان کو انتہائی سنجیدہ انسان بنانا چاہتا ہے۔ یہ خدا کی منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔ ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ خدا کے فیصلے پر راضی ہو اور انسانیت کی تعمیر کی راہ میں اپنا وہ حصہ ادا کرے جو اس سے مطلوب ہے۔ یعنی اپنے سنجیدہ کلام اور پُر درد پیغام کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی۔

ایسا انسان گویا کہ خدا کی طرف سے ایک چنا ہوا انسان (choosen person) ہوتا ہے۔ اس کو خدا کی خصوصی رحمت کا ایک حصہ ملا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو چاہیے کہ وہ خدا کا شکر گذار بندہ بنے۔ وہ اپنے آپ کو احساسِ محرومی کے منفی جذبے سے بچائے۔ وہ مکمل طور پر مثبت نفسیات والا ایک انسان بنے۔ تاکہ وہ خدا کے بندوں کے درمیان وہ اصلاحی رول ادا کر سکے جو خدا نے اس کے لیے مقدر کیا ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ایک حدیث میں ہے کہ انسان کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے (القلوب بین اصبعی الرحمن) یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل پتھر کی طرح کوئی جامد چیز نہیں۔ انسان کا دل نہایت نرم ہے، اور وہ نہایت

آسانی سے بدل سکتا ہے۔ بدلنے کا یہ معاملہ خدا کے قائم کردہ فطری قانون کے تحت ہوتا ہے۔ وہ فطری قانون یہ ہے کہ نزاعی معاملات میں اگر آپ دوسروں کو ذمّے دار ثابت کرنے کی کوشش کریں تو اس سے فریقِ ثانی کے اندر ضد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اس کے برعکس، اگر آپ ایسا کریں کہ نزاع کے وقت یک طرفہ طور پر خود اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں تو فریقِ ثانی کا دل نرم پڑ جائے گا اور نہایت آسانی کے ساتھ نزاع کا ماحول ختم ہو جائے گا۔

اِس سفر کے دَوران ایک انوکھا تجربہ ہوا۔ میں رات کو سو کر صبح میں اٹھا تو سورج کی ابتدائی کرنیں فضا کو منور کرتی ہوئی نظر آئیں۔ میری زبان پر یہ الفاظ آئے ہر روز جب رات کے بعد سنہری صبح طلوع ہوتی ہے تو وہ انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اِسی طرح ایک اور صبح طلوع ہونے والی ہے جو زیادہ روشن اور زیادہ مبارک ہوگی۔ یہ صبح ابدی طور پر ہر قسم کے اندھیروں کو ختم کردے گی، یہ صبح ابدی طور پر انسان کو پُر مسرت زندگی کا تحفہ عطا کرے گی۔ اِس کے بعد انسان ابدی طور پر غیر معیاری دنیا سے نکل کر معیاری دنیا میں پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد ایک ایسا دَورِ حیات شروع ہوگا جس میں ہر چیز مکمل ہوگی۔

قرآن میں اِس دنیا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حُزن (**لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون**) حدیث میں میں آیا ہے کہ جنت مس نہ شور ہوگا اور نہ تکلیف (**لا صخب فیھا و لا نصب**) اِن چار الفاظ میں جنت کی پوری تصویر موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ جنت ہر قسم کی محدودیت سے خالی ہوگی۔ وہاں کسی بھی قسم کے ناموافق حالات موجود نہ ہوں گے۔ وہاں خوشی اور راحت اپنی اعلیٰ ترین صورت میں مہیّا ہوگی۔ اِس جنت کی قیمت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی آخرت کی جنت کو حاصل کرنے کے لیے دنیا کی جنت کی قربانی پر راضی ہو جائے۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اخباروں اور جلسوں میں اگر چہ ہندستان کے مسلمانوں کی منفی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ مگر یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان نہایت تیزی کے ساتھ ہر میدان میں ترقی کر رہے ہیں۔ مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ

۱۹۶۷ میں میں دہلی آیا۔ اُس وقت دہلی کے مسلمانوں کے پاس صرف چند کاریں تھیں۔ جمع اور عید کے دن مسجدوں کے سامنے کوئی کار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب جمع اور عید کے دن مسجدوں کے سامنے کاروں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ دہلی میں آپ جدھر جائیے مسلمانوں کے پاس کار اور موبائل ٹیلی فون جیسی چیزیں کثرت سے نظر آئیں گی۔

انھوں نے کہا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کار ہونے کا نام ترقی ہے۔ میں نے کہا کہ موٹر کار اور موبائل ٹیلی فون کوئی سادہ چیز نہیں۔ یہ دراصل کمیونیکیشن اور حرکت (mobility) کا نام ہے۔ وہ کنٹیکٹ اور انٹریکشن کو لامحدود حد تک بڑھاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ساری ترقیاں اسی سے کے جڑی ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں انسانی تعلقات بہت محدود ہوتے تھے، اس لیے ترقی کے امکانات بھی محدود ہوتے تھے۔ موجودہ زمانے میں مشینی ذرائع نے رفتار کو پہیہ اور الیکٹرانک لہریں عطا کردی ہیں۔ اس کے نتیجے میں حرکت وعمل کے مواقع لامحدود حد تک بڑھ گیے ہیں۔

کار اور ٹیلی فون اِسی زمانی تبدیلی کی علامت ہے۔ جب ٹیلی فون پر کسی کال کی گھنٹی بجتی ہے یا جب کار کسی روڈ پر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ نیا زمانہ تیز رفتار ترقی کا زمانہ ہے۔ مسلمانوں نے شعوری طور پر تو نہیں لیکن غیر شعوری طور پر اس حقیقت کو دریافت کرلیا ہے۔ اِس دریافت کی طرف ان کا سفر بھی شروع ہو چکا ہے۔ بہت جلد ایسا ہوگا کہ ہندستان کے مسلمان پورے برصغیر ہند میں مثالی ترقی کا نمونہ بن جائیں گے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں ہر آدمی کا سب سے بڑا کنسرن اس کی اولاد بن گئی ہے۔ انسان کو جو محبت خدا کے ساتھ ہونی چاہیے وہ محبت اس کو اپنی اولاد سے ہوگئی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق، اِس کا سبب موجودہ زمانے میں مال اور دنیوی ترقی کا غیر معمولی اضافہ ہے۔

قدیم زرعی دَور میں یہ مزاج صرف بادشاہوں کا ہوا کرتا تھا۔ قدیم زمانے میں صرف بادشاہ وہ شخص ہوتا تھا جس کے پاس سلطنت کی صورت میں ایک بڑی چیز ہوتی تھی۔ چنانچہ ہر بادشاہ کی یہ

کوشش ہوتی تھی کہ اس کی سلطنت اس کے بعد اس کے بیٹے کو ملے۔ موجودہ زمانے میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں مال اور مادّی ساز وسامان کی بھرمار ہوگئی۔ اب ہر آدمی کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مادّی ترقی کرے۔

اِس چیز نے موجودہ زمانے میں عمومی طور پر اولاد پرستی کا مزاج پیدا کیا۔ اب آدمی محنت کرکے پیسہ کماتا ہے، شان دار گھر بناتا ہے اور شان دار قسم کے مادّی ساز وسامان اپنے گرد اکھٹا کرتا ہے، اس کے بعد جب وہ سوچتا ہے کہ جلد ہی میں مرجاؤں گا تو اس کو یہ خیال آنے لگتا ہے کہ یہ دولت جو میں نے کمائی ہے وہ میرے بعد کون لے گا۔ یہی مزاج آدمی کے اندر اولاد پرستی پیدا کرتا ہے۔

ہمارے یہاں ایک صاحب تھے ان کا نام عظیم الدین تھا۔ انھوں نے بزنس میں کافی پیسہ کمایا۔ لیکن ان کے یہاں اولاد نہ تھی۔ ان کی بوڑھی ماں اکثر یہ کہتی رہتی تھیں کہ ہائے! عظیم کی دولت کون لے گا۔ پہلے زمانے میں صرف بادشاہ کے اندر یہ مزاج ہوگا کہ ہائے! میری سلطنت کون لے گا، کیوں کہ قدیم زرعی زمانے میں کوئی بڑی چیز صرف بادشاہ کے پاس ہوتی تھی۔ اب ہر آدمی کے پاس کوئی بڑی مادی چیز ہے۔ کیوں کہ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ میرے بعد یہ چیز صرف میرے بیٹے کو ملے۔ اِس چیز نے موجودہ زمانے میں اولاد پرستی کو عام بنا دیا ہے۔

ایک صاحب جو سوشلسٹ نظریات سے متاثر تھے، ان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پوری تاریخ میں تمام مصلحین اور مفکرین ایک غلط تقسیم (dichotomy) میں مبتلا رہے ہیں۔ ہر ایک نے یہ کیا کہ سماج کو محروم اور غیر محروم (the haves and the have nots) طبقات میں بانٹ کر دیکھا۔ ہر ایک یہ کوشش کرتا رہا کہ وہ اِس تقسیم کو ختم کرکے معاشی برابری کا سماج قائم کرے، اور جب ایسا نہیں ہوا تو انھوں نے اس کو خلافِ عدل قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک سماجی بُرائی (social evil) ہے۔ اس تصور کو لے کر وہ خدا کے بارے میں شبہات میں مبتلا ہوگیے۔

یہ سارا معاملہ غلط فکری کا نتیجہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بظاہر جو تقسیم ہے وہ محروم اور غیر محروم (the haves and the haves-nots) کی نہیں ہے۔ زیادہ درست طور پر وہ تقسیم بالقوّہ غیر محروم

اور بالفعل غیر محروم (potential haves and actual haves) کی ہے۔ یعنی کچھ لوگ آج بظاہر محروم نظر آتے ہیں۔ لیکن کل وہ غیر محروموں کی فہرست میں شامل ہوجاتے ہیں۔

اِس کی مثالیں آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ خود اپنے خاندان میں بھی۔ ملکی اعتبار سے اس کی ایک مثال ڈاکٹر عبدالکلام ہیں۔ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں وہ ایک محروم شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن آج وہ ہندستان کے صدر ہیں، اور دہلی کے راشٹر پتی بھون (قدیم وائس ریگل لاج) میں رہتے ہیں۔ ان کی حفاظت پر ہزاروں فوجی جوان مقرر ہیں۔ وہ اسپیشل ہوائی جہاز پر سفر کرتے ہیں، وغیرہ۔

ایک مجلس میں میں نے ایک سبق آموز واقعہ سنایا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ایک کار پر سفر کر رہا تھا۔ اچانک بہت زور کی آواز آئی اور ہماری گاڑی رک گئی۔ میں نے سمجھا کہ کسی نے بھاری پتھر ہماری گاڑی پر پھینک دیا ہے۔ اس وقت ہماری گاڑی ریڈ لائٹ پر رُکی ہوئی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ ایک ہندو نوجوان اپنی موٹر سائکل تیزی کے ساتھ دوڑاتا ہوا ہماری گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اِس کے بعد موٹر سائکل بھی گر گئی اور وہ نوجوان بھی سڑک پر گر پڑا۔ ہمارا ڈرائیور نہایت غصے میں گاڑی سے اُترا اور ہندو نوجوان کی طرف بڑھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کو مارے گا لیکن معاملہ بالکل مختلف ثابت ہوا۔

ہندو نوجوان اُس وقت سڑک پر گرا ہوا تھا اس نے ڈرائیور کو دیکھتے ہی اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی کے انداز میں کہا: بھائی صاحب! معاف کر دیجئے میں بہت غریب آدمی ہوں۔ نوجوان کے اِس کھلے اعتراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈرائیور کا دل بالکل نرم پڑ گیا۔ اب ڈرائیور کے ذہن میں آیا کہ وہ نوجوان کو مارنے کے بجائے جلد از جلد اس کو اسپتال پہنچائے۔ اس کے بعد ڈرائیور نے یہ کیا کہ اس نے ایک اور گاڑی روکی، اور اس پر ہم کو بٹھا کر آگے کے لیے روانہ کیا اور خود یہ کیا کہ زخمی نوجوان کو اپنی گاڑی پر بٹھا کر اسپتال لے گیا اور اس کو فرسٹ ایڈ پہنچائی۔

اس واقعے میں بہت بڑا سبق ہے۔ مذکورہ نوجوان اگر ڈرائیور سے لڑ جاتا، وہ اپنے کو بے قصور ظاہر کر کے ڈرائیور کو بُرا بھلا کہتا تو معاملہ مزید بڑھتا۔ اب ڈرائیور نوجوان کو فرسٹ ایڈ پہنچانے کے

بجائے اس کو پولیس اسٹیشن لے جاتا۔ اس کے برعکس، جب نوجوان نے عاجزی کا اظہار کیا اور فوراً ہی اپنی غلطی مان لی تو ڈرائیور کے دل میں اس کے لیے ہمدردی آ گئی۔ اب وہ یہ چاہنے لگا کہ نوجوان کو سزا دینے کے بجائے اس کو طبّی مدد پہنچائی جائے۔

یہ واقعہ بظاہر ایک چھوٹا واقعہ ہے لیکن اس کے اندر بہت بڑا سبق ہے۔ وہ سبق یہ کہ فریقِ ثانی کا دل آپ کی مٹھی میں ہے۔ آپ چاہے اس کو بھڑکا کر اس کو اپنا دشمن بنا لیجئے یا ٹھنڈا طریقہ اختیار کر کے اس کو اپنا دوست بنا لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص آپ کو بظاہر دشمن نظر آتا ہے وہ بالقوّہ طور پر آپ کا دوست ہے۔

نزاعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ یہ بحث کرنے لگتے ہیں کہ صحیح کون ہے، اور غلط کون۔ نزاعی معاملات میں اِس قسم کی بحث سرتاسر بے معنی ہے۔ نزاعی معاملات کو ہمیشہ عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ یعنی نزاع کو ختم کرنے کی عملی تدبیر کیا ہے۔ نزاعی معاملے میں صحیح اور غلط کی بحث چھیڑنا مسئلے کو بڑھاتا ہے، اور نزاعی معاملے میں عملی حل کا طریقہ اختیار کرنا نزاع کو فوراً ختم کر دیتا ہے۔

جلد ہی آزادی کے ساٹھ سال پورے ہو جائیں گے۔ مگر ابھی تک ملک میں مطلوب ترقی نہ ہو سکی جب کہ اس سے کم مدت میں سنگاپور اور ساؤتھ کوریا اور جاپان جیسے ملک اعلیٰ ترقی حاصل کر چکے ہیں۔

انسانی ترقی کے اعتبار سے دنیا کے ۱۷۷ ملکوں میں ہندستان کا نمبر ۱۲۷ واں ملک۔ انڈیا میں اگر کہیں کچھ ترقی دکھائی دیتی ہے تو وہ آزادی کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ زمانی اسباب کی بنا پر ہے۔ اگر ملک میں سیاسی آزادی نہ آتی تب بھی یہ ترقیاں یقیناً موجود ہوتیں، ٹھیک اُسی طرح جیسے آزادی کے بغیر ہندستان میں ریلوے، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور اسٹیم انجن وغیرہ آ چکے تھے۔

اس کا سبب میرے تجربے کے مطابق، یہ ہے کہ آزادی کے وقت ملک میں تعمیر و ترقی کا کام صحیح رُخ پر شروع نہ ہو سکا۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ سیاسی آزادی اپنے آپ میں ہر قسم کی بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یہ اندازہ صحیح نہ تھا۔ نہرو حکومت کا تصور یہ تھا کہ اقتصادیات پر حکومت کا

کنٹرول ہر قسم کی بھلائی کا سرچشمہ ہے۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ یہ تشخیص بھی درست نہ تھی۔ اسی طرح انتہا پسند ہندو لیڈروں کا ماننا یہ تھا کہ بھگوا کرن (saffronisation) ہندوتو کے فارمولے میں ساری بھلائیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔ مگر وہ بھی عملی تجربے کے بعد ناکام ثابت ہوا۔

میرا نظریہ اس معاملے میں مختلف ہے۔ اس موضوع پر ۱۹۴۷ سے لکھتا رہا ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد فوراً ملک میں دونکاتی پروگرام چلانا چاہیے تھا— تعلیم اور انفراسٹرکچر۔ ہر دوسری چیز کو مؤخر کرکے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ سارے ملک میں تعلیم کا جال بچھا دیا جائے۔ تعلیم کے مواقع اتنا زیادہ عام کیے جائیں کہ کوئی شخص تعلیم کے بغیر نہ رہے۔ اور دوسری چیز اچھا انفراسٹرکچر یعنی سڑکیں، بجلی، ٹیلی فون، وغیرہ۔ سنگاپور، ساؤتھ کوریا اور جاپان میں جو ترقی ہوئی ہے وہ اسی دونکاتی فارمولے کا نتیجہ ہے۔

تعلیم کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ وہ آدمی کو حیوانی سطح سے اُٹھا کر انسانی سطح تک پہنچاتی ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ کسی قوم کے خواص اپنے عوام کو اعلیٰ افکار اور تجربات سے باخبر کرسکیں۔ جس سماج میں تعلیم نہ ہو وہاں خواص اور عوام کے درمیان ایک قسم کا فکری بُعد (intellectual gap) پیدا ہو جائے گا۔ عوام اپنے خواص کے تجربات میں حصے دار نہ بن سکیں گے۔

خواص کی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کے لیے ذہن ساز گروہ (opinion maker group) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس سماج میں لوگ تعلیم یافتہ ہوں تو وہ اتنے باشعور ہوں گے کہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے خواص کی باتوں کو سمجھیں گے اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کریں گے۔ مگر جس سماج میں تعلیم عام نہ ہوئی ہو وہاں گویا تعمیر و ترقی کے عمل کا آغاز ہی مشکل ہو جائے گا۔ مثلاً تعمیر و ترقی کے آغاز کے لیے ابتدا میں کچھ سخت فیصلے (hard decisions) لینے پڑتے ہیں۔ سماج کو اتنا باشعور ہونا چاہیے کہ وہ ان فیصلوں کو قبول کرسکے۔ مگر جب سماج کے لوگ باشعور نہ ہوں تو ہر ایسے موقع پر وہ بھڑک کر تعمیر و ترقی کے کام کو روک دیں گے۔

انفراسٹرکچر کی اہمیت کسی سماج میں وہی ہے جو کسی گاڑی میں اُس کے پہیے کی ہوتی ہے۔ اگر

پہیہ ہوتو گاڑی چلے گی اور اگر پہیہ موجود نہ ہوتو گاڑی اپنا سفر ہی شروع نہ کر سکے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ترقی چاہتا ہے۔ ہر مرد اور عورت کے اندر بے پناہ حد تک یہ جذبہ ہے کہ وہ ترقی کے سفر کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھے۔ ایسی حالت میں ضرورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اچھا انفراسٹرکچر فراہم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر ترقی کی طرف دوڑنے لگے گا۔

جیسا کہ معلوم ہے، مغربی ملکوں میں شہر اور گاؤں کے درمیان وہ فرق نہیں ہے جو انڈیا جیسے ملکوں میں دکھائی دیتا ہے۔ سہولیات کے اعتبار سے وہاں کے گاؤں کی حالت تقریباً ویسی ہی ہے جیسا کہ وہاں کے شہر کی حالت ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ شہر میں زیادہ پھیلاؤ ہے۔ جب کہ گاؤں کی حیثیت ایک چھوٹی دنیا کی ہے۔

ان ملکوں میں یہ کیا گیا کہ انھوں نے شہر سے لے کر گاؤں تک ہر جگہ اچھی سڑکیں پھیلا دیں۔ ہر جگہ بجلی کا اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ ٹیلی فون کا نظام ہر جگہ بہترین طور پر موجود ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جو ترقیاتی عمل میں ذریعے کی حیثیت رکھتی ہیں وہ ہر جگہ اعلیٰ پیمانے پر موجود ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کا راز یہی انتظام ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ترقی طلب حیوان (progress-seeking animal) ہے۔ وہ خود اپنے اندرونی جذبات کے زور پر ترقی کی طرف دوڑنا چاہتا ہے۔ اس لیے ترقی کے عمل میں اصل ضرورت یہ ہے کہ انسان کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے اور اس کے لیے عمدہ انفراسٹرکچر فراہم کر دیا جائے۔ اس کے بعد انسان خود ہی ترقی کی طرف دوڑنے لگے گا۔

بدقسمتی سے انڈیا میں اس راز کو سمجھا نہیں گیا۔ ہمارے لیڈر ترقی کے فطری فارمولے سے بے خبر رہے۔ وہ اپنا خود ساختہ فارمولا آزماتے رہے۔ اسی غیر فطری طریقے کا یہ نتیجہ ہے کہ انڈیا میں ترقی کا عمل درست طور پر جاری نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر ہند کے تمام لیڈروں، مسلم اور غیر مسلم دونوں پر وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو میں نے ایک بار ماہنامہ الرسالہ کے صفحۂ اول پر شائع کیے

تھے: خوش فہم آدمی ایک ایسے سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگتا ہے جس کا ابھی اُس نے آغاز بھی نہیں کیا۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں اقتصادی ترقی کے کئی ماڈلوں کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مثلاً روس کا ماڈل جو مکمل اسٹیٹ کنٹرول کے اصول پر مبنی تھا۔ انڈیا کا ماڈل جو مکسڈ اکانومی (mixed economy) کے اصول پر مبنی تھا۔ امریکا کا ماڈل جو آزاد کمپیٹیشن کے اصول پر مبنی تھا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ روس اور انڈیا کا ماڈل قابل بقا (sustainable) ثابت نہ ہوسکا اور ناکام ہوگیا۔ اس کے برعکس، امریکا کا ماڈل دوسو سال سے کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ کسی سسٹم کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ قابلِ بقا ثابت ہو۔ جو سسٹم قابلِ بقا ثابت نہ ہو وہ غیر فطری ہے۔ اور کسی سسٹم کا غیر فطری ہونا ہی اس کو قابلِ رد قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

میں نے مزید کہا کہ کسی سسٹم کو آئیڈیل سے جانچا نہیں جاسکتا۔ کیوں کہ اس دنیا میں آئیڈیل سرے سے قابل حصول ہی نہیں۔ اس دنیا میں کسی سسٹم کو لینے کے لیے صرف یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قابلِ عمل ہے یا نہیں۔ کسی سسٹم کو آئیڈیل سے جانچنا تخیّل پسند آدمی کا کام ہوسکتا ہے، مگر وہ حقیقت پسندانہ آدمی کا کام نہیں۔

۲۵ جنوری ۲۰۰۶ کی شام کو پروگرام ختم ہوگیا۔ انسٹی ٹیوٹ والوں کا کہنا تھا کہ رات کو میں واردھا میں ٹھہروں اور اگلی صبح کو یہاں سے روانہ ہوکر ناگپور جاؤں۔ لیکن میں نے یہ طے کیا کہ اس وقت شام کو مجھے ناگپور چلے جانا چاہیے۔ اس طرح واردھا سے روانہ ہوکر ۲۵ جنوری کی شام کو مغرب کے بعد ناگپور پہنچا۔

ناگپور میں میرا قیام مسٹر عبدالسلام اکبانی صاحب کے مکان پر تھا۔ یہاں جسٹس ایم۔ ایم۔ قاضی (ریٹائرڈ) بھی آگیے۔ ان لوگوں کے ساتھ رات کا کھانا مسٹر عبدالسلام اکبانی کے گھر پر کھایا۔ اس کے بعد ہم لوگ دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ حسب معمول میں نے جسٹس ایم۔ ایم۔ قاضی سے پوچھا کہ آپ اپنا کوئی تجربہ بتایئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ تجربات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے مجھے آپ کے بعض خیالات کو ماننے میں تردّد ہوتا تھا۔ مگر اب تجربات کے بعد میں آپ سے متفق ہوگیا ہوں۔

ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کام کسی قسم کے عملی پروگرام سے نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کی اصلاح کا حقیقی کام صرف اُس فکری جدوجہد سے ہوسکتا ہے جس کو آپ ذہن کی تعمیرِ نَو (re-engineering of mind) کہتے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کی کمزوریاں کسی خارجی دشمن کی بنا پر نہیں ہیں وہ صرف مسلمانوں کے اپنے فکری زوال کی بنا پر ہیں۔ اور جب تک فکر کی سطح پر انقلاب نہ لایا جائے خارجی سطح پر کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔

بہت پہلے جب کہ میں یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک دن ٹرین سے سفر کرتے ہوئے کچھ گاؤں کے لوگ ملے۔ یہ لوگ زمین کے ایک مقدمے کے سلسلے میں اعظم گڈھ جارہے تھے تاکہ وہاں عدالت میں پہنچ سکیں۔ ایک بوڑھے آدمی نے اپنے کیس پر بات کرتے ہوئے کہا: آپَن کا گدتو پُورہَو (اپنا کاغذ تو پورا ہے)۔ اس آدمی کا مطلب یہ تھا کہ میں نے کاغذی کارروائی کرکے قانونی شرطوں کو پورا کرلیا ہے۔ اب عدالت میں میرا معاملہ بگڑنے والا نہیں ہے۔

یہی معاملہ آج کل کے مسلمانوں کا ہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دائرے میں ''کاغذی کارروائی'' کو پورا کررکھا ہے۔ ہر ایک اپنے ذہن کے مطابق، اپنے لیے ایک محفوظ دنیا بنائے ہوئے ہے۔ اِس طرح ہر ایک فرضی یقین (false conviction) میں جی رہا ہے۔

کوئی روایتی مذہب پر قائم ہے۔ کوئی فارم والی بے روح دین داری پر عامل ہے۔ کوئی کسی درگاہ میں حاضری دے رہا ہے۔ کوئی کسی مسجد اور مدرسے سے جڑا ہوا ہے۔ کوئی کسی جماعت کو پکڑے ہوئے ہے۔ کوئی کسی بزرگ کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ کوئی کسی کمیونٹی ورک میں مشغول ہے۔ کوئی تقریر اور تحریر کے میدان میں مصروفِ جہاد ہے، وغیرہ۔

اِن چیزوں نے لوگوں کے اندر اپنے ہدایت یاب ہونے کا فرضی یقین پیدا کردیا ہے۔ یہ فرضی یقین اِس میں رُکاوٹ بن گیا ہے کہ وہ نئی باتوں پر سوچیں، وہ اپنے ذہنی خول کو توڑ کر کوئی نئی رائے بنانے کی کوشش کریں۔

فجر کی نماز کے بعد دوبارہ ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ عبدالسلام اکبانی کے صاحب زادے

مسٹر زبیر احمد اکبانی ایک ذہین اور سنجیدہ نوجوان ہیں، اُن سے بھی کافی باتیں ہوئی۔

مدرسے سے تعلق رکھنے والے دو صاحبان ملے۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اکثر لوگ اپنے ذہن میں ایک معیار قائم کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کو معیار بنایا جائے اور اس کی روشنی میں رائے قائم کی جائے۔ امام احمد بن حنبل نے اس نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **ایتونی بشیٔ من کتاب اللہ حتی أقول**۔

گفتگو کے دوران میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ آپ ماہ نامہ الرسالہ کا مطالعہ کیجئے۔ اس سلسلے میں میں نے ان لوگوں سے کہا کہ حدیث میں مؤمن کے بارے میں آیا ہے کہ: أن یکون بصیراً بزمانہ۔ میں نے کہا کہ الرسالہ لوگوں کو ''بصیرِ زمانہ'' بنانے کی ایک کوشش ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ ہر بات قرآن اور حدیث سے اخذ کرنا چاہیے پھر قرآن اور حدیث میں یہ کہاں لکھا ہے کہ ماہ نامہ الرسالہ پڑھو۔

میں نے کہا کہ ہمارے علماء یہ مانتے ہیں کہ علوم دو قسم کے ہیں — علوم عالیہ اور علومِ آلیہ۔ میں نے کہا کہ اس تقسیم کے مطابق، ماہ نامہ الرسالہ کا تعلق علومِ آلیہ سے ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ علماء کے نزدیک، علومِ آلیہ کی اہمیت علمی طور پر اتنی زیادہ ہے کہ ان کی تحصیل کے بغیر آپ لوگوں کو مدراس میں عالم اور فاضل کی سند نہیں ملتی۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گیے۔

ایک صاحب سے میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے: **قل ربی اللہ ثم استقم** (کہو کہ اللہ میرا رب ہے اور پھر اس پر جم جاؤ) اِس سے معلوم ہوا کہ معرفتِ خداوندی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی تاحیات اس پر قائم رہے۔ تاحیات قائم رہنا کوئی سادہ بات نہیں۔ موجودہ امتحان کی دنیا میں ہر وقت کوئی نہ کوئی بات ایسی پیش آتی ہے جو آدمی کو سچائی کے راستے سے ہٹا دے۔

کسی وقت کوئی خواہش جاگتی ہے۔ کبھی کسی بات پر دل کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ کبھی کوئی ایسی خلافِ مزاج بات پیش آتی ہے جو آدمی کی انانیت کو جگا دیتی ہے۔ کبھی کوئی انٹریسٹ (مفاد) آدمی کو اصولی روش سے ہٹا دیتا ہے۔ کبھی کسی بڑے فائدے کی امید آدمی کے اوپر غالب آجاتی ہے۔ اِس

طرح کی مختلف چیزیں بار بار سامنے آتی ہیں۔ یہ باتیں آدمی کے ایمان اور استقامت کو ڈگمگا دیتی ہیں۔ وہ اللہ کی ربوبیت پر ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آدمی روزہ اور نماز جیسے اعمال کے ذریعے جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔ رہے گناہ تو وہ استغفار کے ذریعے معاف ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اگر جمعہ کی نمازِ عصر کے بعد ۸۰ مرتبہ یہ درود پڑھے تو اس کے ۸۰ سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے:

اللھم صلّ علی محمد بن النبی الأمّی وعلیٰ اٰله وسلّم تسلیماً

میں نے کہا کہ یہ بلاشبہہ دینِ خداوندی کا غلط تصوّر ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں اَمانی (البقرہ:۱۱۱) کہا گیا ہے۔ یعنی اپنی خوش خیالیوں کو خدا کا دین سمجھ لینا۔ جس چیز کو آپ اعمال کہہ رہے ہیں وہ دراصل ظواہر اعمال یا اعمال کے فارم ہیں۔ جنت کا استحقاق کسی بھی قسم کی ظاہری اعمال کی ادائیگی یا کسی بھی قسم کے الفاظ کی لسانی تکرار پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے مطابق، وہ سرتاسر جنتی شخصیت کی تعمیر پر منحصر ہے۔

قرآن میں جنت کے بارے میں ہے کہ: ذلک جزاء من تزکّیٰ (طٰہٰ: ۷۶)۔ یعنی جنت اُس شخص کے لیے جو اپنا تزکیہ کرے۔ تزکیہ سے مراد داخلی شخصیت کی تطہیر ہے۔ جنت میں صرف مطہّر روح (purified soul) کو جگہ ملے گی۔ مطہّر روح وہ ہے جس نے افکار کے جنگل میں خدا کی معرفت حاصل کی۔ جس نے فراموشی کی دنیا میں خدا کی گہری یاد کا تجربہ کیا۔ جس کو اجتماعی زندگی میں منفی تجربات ہوئے مگر اس نے ان منفی تجربات کو اپنے لیے مثبت روحانی غذا میں ڈھال لیا۔ جس نے غیب میں خدا کا مشاہدہ کیا۔ جس نے اپنی خواہشات کو خدا اور رسول کے تابع بنا دیا۔ جو اس طرح جنت کا طالب بنا کہ دوسری تمام محبوب چیزیں اس کے لیے غیر اہم بن گئیں۔ یہی تزکیۂ نفس ہے، اور اِس تزکیہ نفس کے بغیر کسی کو جنت ملنے والی نہیں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف الفاظ کا علم کافی نہیں ہے۔ قرآن کی طرح، حدیث کا بھی ایک ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا اس کا باطن ہوتا ہے۔ حقیقت

یہ ہے کہ حدیث کی داخلی معنویت کو سمجھے بغیر حدیث کو گہرائی کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا۔

مثلاً ایک روایت کے مطابق، جنتی انسان کی ایک پہچان یہ ہے کہ: **قلبہ معلّق بالمساجد**۔ یعنی اس کا دل مسجد میں لگا ہوا ہو۔ عام طور پر اس حدیث کو مسجد کی عمارت سے وابستہ کر کے لیا جاتا ہے۔ یعنی مسجد میں آنا، جانا اور مسجد کی خدمت کرنا وغیرہ۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس حدیث کا مطلب ہے **قلبہ معلّق باللہ**۔ یعنی وہ انسان جس کا دل اللہ میں لگا ہوا ہو۔ وہ اللہ کو یاد کرتا رہے۔ زندگی کے ہر تجربے میں اس کو ربّانی غذا ملتی رہے۔ اس کے جذبات اللہ سے وابستہ ہو گیے ہوں۔ وہ جہاں بھی ہو اور جس ماحول میں بھی ہو اس کا دل خدا کی یاد میں سرشار ہو۔ اس حدیث کا مطلب حقیقتاً خدا سے انسان کے تعلق کو بتانا ہے نہ کہ کسی عمارتی ڈھانچے سے اس کے تعلق کو بیان کرنا۔ مسجد کی اہمیت یہی ہے کہ وہ خدا کی یاد کی علامت ہے۔ مسجد معروف معنوں میں کوئی مقدس عمارتی ڈھانچہ نہیں۔ وہ اللہ میں جینے کی تربیت حاصل کرنے کا مرکز ہے۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ قدیم زمانے میں مسلمانوں نے بڑی بڑی ترقیاں کیں۔ وہ علوم اور فنون میں ساری دنیا کے امام بن گیے۔ پھر انھوں نے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی علمی پستی کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ مسلم دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ہمارے دشمن نہیں چاہتے کہ ہم اعلیٰ ترقی کے درجے تک پہنچیں۔ اس لیے وہ ہر پہلو سے ہم کو نیچے دھکیلنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ دشمنی اور رقابت ایک عمومی حالت ہے۔ وہ ہر دور میں باقی رہتی ہے۔ قدیم زمانے میں جب مسلمانوں نے ترقی کی، تب بھی ان کے دشمن موجود تھے اور دشمنوں کی دشمنانہ کارروائیوں کے باوجود انھوں نے ترقیاتی کام کیا۔ اسی طرح آج بھی مسلمانوں کو منفی حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ترقی کرنا چاہیے۔ انھوں نے اِس نقطۂ نظر کو نہیں مانا اور دیر تک بحث کرتے رہے۔ آخر میں یہ کہہ کر بات کو ختم کر دیا کہ یہ بھی ایک ڈائمنشن ہے، یعنی یہ بھی سوچنے کا ایک طریقہ ہے۔

میرا تجربہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ غلطی کا اعتراف کرنا نہیں جانتے۔ وہ خوب صورت الفاظ بول کر اپنی غلطی پر پردہ ڈالتے رہتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ بظاہر ہوشیاری کر رہے ہوتے ہیں مگر وہ زبردست

نادانی ہے۔ کیوں کہ اِس بے اعترافی کی انھیں بھاری قیمت دینی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کا علمی اور فکری ارتقا رُک جاتا ہے۔

حیدرآباد سے ایک مجلّہ ''اقبال ریویو'' کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ نومبر ۲۰۰۵ میں ایک مضمون نظر سے گذرا۔ اس کا عنوان یہ تھا— سیّد جمال الدین الہ آبادی۔ لکھنے والے مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

''مشہور ہے کہ جب پیرس میں روسی سفیر نے سید جمال الدین افغانی سے ملنا چاہا تو انھوں نے ملاقات کی تاریخ ایسی مقرر کی جو دو ہفتے بعد آنے والی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک کتب فروش کے یہاں گیے اور اس سے کہا— مجھے فرانسیسی میڈیم میں، روسی زبان سکھانے والی کتاب چاہیے۔ میں اس کو خرید لوں گا۔ بشرطیکہ تم اس کا بھی انتظام کردو کہ آج سے ایک ہفتے بعد کوئی روسی زبان بولنے والا آدمی مجھ سے ملاقات کر سکے۔

کتب فروش نے کتاب بھی دی، اور ایک ایسے شخص کا انتظام بھی کر دیا جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ جمال الدین افغانی نے ایک ہفتے تک بطور خود کتاب دیکھی۔ پھر آٹھویں دن سے چودھویں دن تک روز ایک گھنٹہ اس سے روسی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ اور پھر پندرہویں دن وہ تیار ہو گیے تھے کہ روسی سفیر سے بغیر کسی مترجم کی وساطت کے ملاقات کریں''۔ (صفحہ: ۱۷)

میری معلومات کے مطابق، سید جمال الدین افغانی کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ انتہائی غیر معمولی حافظہ رکھتے تھے۔ اِسی بنا پر انھوں نے بہت سی زبانیں سیکھ لیں۔ وہ جو کتاب بھی پڑھتے وہ انھیں یاد ہو جاتی۔ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ان کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف زبانوں میں بات کر سکتے تھے۔ مزید یہ کہ جب وہ بات کرتے تو ان کی بات میں معلومات کا انبار ہوتا تھا۔ اِس بنا پر لوگ ان کو بہت زیادہ قابل سمجھنے لگے۔ مگر یہ غیر معمولی قابلیت کی بات نہ تھی بلکہ یہ غیر معمولی حافظے کی بات تھی۔

میرا تجربہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر غیر معمولی حافظے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ تجزیہ

(analysis) کی صلاحیت سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس معلومات ہوتی ہے مگر وہ معلومات کا تجزیہ کرکے اس سے کوئی بامعنی نتیجہ نہیں نکال پاتے۔ ان کی گفتگو میں معلومات کا سیلاب ہوتا ہے۔ اِس کو دیکھ کر لوگ غلطی فہمی میں پڑ جاتے ہیں اور ان کو قابل سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حیثیت کمپیوٹر جیسی ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کے پاس بے شمار معلومات ہوتی ہیں مگر کمپیوٹر ایک قابل انسان کا بدل نہیں ہوتا۔

اس مجلّے میں ایک جگہ سید جمال افغانی کی تعریف کرتے ہوئے اقبال کے یہ الفاظ چھپے ہیں:

''ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی، اور اس نے ایران، مصر اور تُرکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا''۔ (صفحہ: ۶)

یہ واقعہ ان کی شخصیت کی اصل کمی کو بتاتا ہے۔ ایسا دراصل اس لیے ہوا کہ سید جمال الدین افغانی صاحب معلومات تو تھے مگر وہ صاحب معرفت نہ تھے۔ ان کو سحر بیانی تو آتی تھی مگر وہ معاملہ فہمی کی صلاحیت سے خالی تھی۔

اصل یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی جن مسلم ملکوں میں گیے، ان کی خطابت اور سحر بیانی کی بنا پر انھیں غیر معمولی پذیرائی ملی۔ ان کی رسائی ہر جگہ حکومت کے قریبی حلقوں تک ہوگئی۔ لیکن ہر جگہ یہ ہوا کہ وہ حکومت مخالف کارروائیوں میں مشغول ہوگیے۔ ہر مسلم حکومت انھیں معیار سے کم نظر آئی۔ وہ اس کو معیاری بنانے کے لیے اس کی توڑ پھوڑ کے درپے ہوگیے۔ ایسا صرف ان کی بے دانشی کی بنا پر ہوا۔ وہ اِس حقیقت کو سمجھ نہ سکے کہ کمی خود ان کی سوچ میں ہے نہ کہ حکومتی نظام میں۔

سید جمال الدین افغانی مختلف زبانوں میں اپنی مہارت کے باوجود اُس حکمت کو سمجھ نہ سکے جو ایک انگریزی مقولے میں اِس طرح بیان کی گئی ہے — معیار قابلِ حصول نہیں:

Ideal can not be achieved.

سید جمال الدین افغانی کو مسلم حکمرانوں میں جو کمی نظر آئی وہ قانونِ فطرت کا نتیجہ تھی، وہ مسلم حکمرانوں کی نالائقی کا نتیجہ نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر سیاسی نظام، حتی کہ خود اسلامی نظام بھی، عملاً ہمیشہ اعلیٰ معیار سے کم (less than ideal) ہوتا ہے۔ کسی موجود سیاسی نظام کو غلط بتا کر اس کو توڑنے کی

تحریک چلانا ہمیشہ اِس نتیجے پر ختم ہوتی ہے کہ اس کی جگہ دوسرا غیر معیاری نظام قائم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام پُر شعور سیاسی انقلابات کا نتیجہ صرف ایک ہوا ہے — ایک غیر معیاری نظام کو توڑ کر اس کی جگہ دوسرا غیر معیاری نظام لانا۔

ایسی حالت میں کسی مُصلح یا ریفارمر کے لیے صحیح پالیسی یہ ہے کہ سیاسی نظام میں حالتِ موجودہ (statusquo) سے عدم تعرّض کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے تعمیری میدانوں میں پُر امن جدوجہد کرنا، موجودہ دنیا میں یہی واحد طریقہ ہے جو کسی مثبت نتیجے تک پہنچانے والا ہے۔

ایک مسلم خاتون انڈیا میں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کناڈا چلی گئیں۔ اب وہ کناڈا کے ایک شہر میں مسلم بچوں کا ایک اسکول چلاتی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے اسکول کا مقصد مسلم بچوں کی اسلامی شناخت (Islamic Identity) کو برقرار رکھنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں مسلمان کافی آباد ہیں۔ ان کی کمائی بھی اچھی ہے، لیکن ان کی نسلوں کو ایک سخت خطرے کا سامنا ہے۔ وہاں مغربی تہذیب کا دَباؤ (pressure) اتنا زیادہ ہے کہ مسلم نوجوان بڑی تعداد میں عیسائی ہو رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی تہذیب اور کلچر کے اعتبار سے عیسائی طریقہ اختیار کر لیتا ہے اور کوئی اپنے دین کو بدل کر باقاعدہ عیسائی بن جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ دباؤ (pressure) کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ دراصل اسلام کی ناقص نمائندگی کا نتیجہ ہے۔ آپ جیسے مصلحین، اسلام کو جس طرح پیش کرتے ہیں وہ مسلم نوجوانوں کو صرف ایک کلچرل شناخت کا مسئلہ نظر آتا ہے۔ کلچرل شناخت ان کو کوئی بڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔

ایک طرف ان کے سامنے مغربی تہذیب کی چمک دمک ہوتی ہے اور دوسری طرف اسلام صرف ایک رسمی شناخت یا بے روح فارم کا معاملہ نظر آتا ہے۔ اس تقابل کی بنا پر اُنھیں اسلام کی لکیر چھوٹی نظر آتی ہے اور مغربی تہذیب کی لکیر زیادہ بڑی۔ اس وجہ سے وہ اسلام کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اس مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ لوگ شناخت کی حفاظت کے مقصد کے تحت، اسکول قائم

کریں۔ اس قسم کی کوشش گویا سیلاب کے آگے تنکوں کا بند بنانا ہے۔ اِس مسئلے کا حل صرف ایک ہے وہ یہ کہ آپ اسلام کی تعلیمات کو وقت کے اسلوب اور اعلیٰ دلائل کے ساتھ پیش کریں۔ تاکہ مسلم نوجوانوں کو اسلام زیادہ عظیم، اور زیادہ بامعنیٰ چیز نظر آنے لگے۔ میں نے کہا کہ ہم اِسی نہج پر کوشش کر رہے ہیں اور اللہ کے فضل سے ہماری کوشش کامیاب ثابت ہوئی۔

مزید میں نے کہا کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں کچھ مصلحین اُٹھے۔ مثلاً سید قطب، محمد اقبال اور سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ۔ ان لوگوں کو وقتی طور پر کچھ جزئی کامیابی ہوئی۔ مگر اب ان کا پیدا کردہ لٹریچر بالکل غیر متعلق (irrelevant) ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں، مسلم دنیا میں مغربی قوموں کا سیاسی غلبہ ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مغربی قوموں سے سخت قومی نفرت پیدا ہو گئی۔ اُس دَور کے مسلم مصلحین نے اِسی نفرت کو استعمال کیا۔ اُس وقت اُن کو مسلم نوجوانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اسی منفی نفسیات کے ماحول میں ردّعمل کی بنا پر ہوئی۔ اُن کی مقبولیت منفی بنیاد پر قائم تھی نہ کہ مثبت بنیاد پر۔ اور منفی بنیاد پر قائم ہونے والی تحریک کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔

ایک عربی مثل ہے کہ: لا لحبّ علي بل لبغض مُعاوية (حُبّ علی کی وجہ سے نہیں بلکہ بُغض معاویہ کی وجہ سے)۔ اس مثال کا تعلق صرف علی اور معاویہ کے معاملے سے نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے عمومی مزاج کو بتاتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے سیاسی حالات میں مسلمان بغضِ مغرب کی نفسیات میں مبتلا تھے۔

ایسے ماحول میں جب اکبر الٰہ آبادی اور اقبال نے مغرب کے خلاف اشعار لکھے اور سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مغرب کے خلاف ادبی انداز میں تنقیدیں کیں۔ سیّد جمال الدین افغانی اور ابوالکلام آزاد نے جب مغرب کے خلاف پُرشور خطابت کا مظاہرہ کیا تو اُس وقت کی مخصوص نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان کی طرف مائل ہو گئی۔ یہ مصلحین چوں کہ اپنے منفی کلام کے حق میں قرآن اور حدیث کے حوالے دیتے تھے، اِس لیے لوگوں نے سمجھا کہ لوگوں کا یہ رجوع اسلام

کی طرف رجوع ہے۔ حالاں کہ یہ سارا معاملہ ''بُغض معاویہ'' کی نفسیات کے تحت تھا نہ کہ ''حُبّ علی'' کی نفسیات کے تحت۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی منفی تحریکیں کبھی کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ مثبت نفسیات سے منفی کردار کا اُبھرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ ببول کے بیج سے انگور کا پھل پیدا ہونا۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان، مسٹر اور مولوی، دونوں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانے پر اسلامی بیداری آئی ہے۔ حتی کہ یہ لوگ موجودہ زمانے کے عہد کو اسلامی بیداری کا عہد کہتے ہیں۔ یہ نظریہ صرف ایک بے بنیاد خوش فہمی پر قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ مسلمانوں کے لیے اسلام سے دوری کا زمانہ ہے نہ کہ اسلام سے قربت کا زمانہ۔

اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد جب بہت زیادہ ہوجائے تو ان کے درمیان ہر کام اسلام کے نام پر ہونے لگتا ہے۔ اس بنا پر لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سارا کام اسلامی کام ہے۔ حالاں کہ یہ سب کام قومی کام ہوتا ہے نہ کہ حقیقتاً اسلامی کام۔

موجودہ زمانے میں ساری دنیا میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے۔ اپنی قومی روایات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو اسلام کے نام پر کرتے ہیں۔ مثلاً اسلامی اسکول، اسلامی کالج، اسلامی یونیورسٹی، اسلامی یتیم خانہ، اسلامی وقف، اسلامی ریڈیو، اسلامی ٹی وی، اسلامی صحافت، اسلامی بینکنگ، اسلامی سیاست، اسلامی اجتماع، اسلامی نقل وحرکت، اسلامی مشن، اسلامی تحریک، اسلامی ملک، اسلامی لٹریچر، اسلامی ادارہ اور اسلامی مدرسہ، وغیرہ۔

گہرائی سے دیکھیے تو یہ سارے کام قومی کام ہوتے ہیں۔ وہ قومی جذبے کے تحت کیے جاتے ہیں، وہ کسی قومی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہوتے ہیں، اسلام (بمعنی دینِ خداوندی) سے ان کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اسلام کا لیبل ہونے کی وجہ سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سارے اسلامی کام ہیں، وہ سب کام ''فی سبیل اللہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس معاملے میں غلط فہمی کا سبب یہ ہے کہ لوگوں نے غلط کرائٹیرین (معیار) بنا رکھے ہیں اسلام میں اصل کرائٹیرین رسول اور اصحاب رسول کا ہے۔ کوئی کام اسلامی ہے یا غیر اسلامی، اس کو سمجھنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ اس کو رسول اور اصحاب رسول کے نمونے کی روشنی میں جانچا جائے۔ اگر وہ اس نمونے کے مطابق ہے تو وہ اسلامی ہے اور اگر وہ اس نمونے کے خلاف ہے تو وہ غیر اسلامی ہے۔

ایک صاحب نے ایک معروف اسلامی مقرر کی بہت تعریف کی۔ انھوں نے ان کی تقریروں کو بڑا اسلامی کام قرار دیا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان اسلامی مقرر کے جلسے میں خوب تالیاں بجتی ہیں کہ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ خوب تالیاں بجتی ہیں۔

پھر میں نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ اور مدینہ میں خطاب کرتے تھے تو کیا وہاں تالیاں بجتی تھیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق جیسے اصحابِ رسول جب خطاب کرتے تھے تو کیا وہاں حاضرین کی طرف سے تالیاں بجتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ یہی فرق یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ لوگوں نے اگرچہ ان کا نام اسلامی مقرر رکھا ہے مگر وہ اسلامی مقرر نہیں ہیں بلکہ وہ قومی مقرر ہیں۔

انھوں نے پوچھا کہ اسلامی مقرر اور قومی مقرر کے درمیان کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ اسلامی مقرر کی باتوں سے دلوں میں خدا کا خوف جاگتا ہے۔ لوگوں کے اندر تقویٰ اور خشیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لوگ خدا کی یاد میں تڑپ اٹھتے ہیں۔ جو تقریر اِس قسم کی کیفیات پیدا کرے، اس کو سُن کر تالیاں نہیں بجیں گی بلکہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں گے۔

اس کے برعکس، قومی مقرر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قومی جذبات کو غذا دیتا ہے۔ اس کو سن کر فخر کی نفسیات جاگتی ہے۔ اس میں اپنا قومی جھنڈا اونچا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لیے ایسے اسلامی مقرر کو قومی شیر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کی تقریروں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک قومی کاروبار ہے نہ کہ اسلام کی کوئی حقیقی خدمت۔

پھر میں نے کہا کہ حدیث کی روشنی میں دیکھیے تو اسلامی کام کے لیے ہمیں ایک واضح معیار ملتا ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ جو کام کیا جائے اس سے لوگوں کے اندر دو چیزیں پیدا ہوں: تقوی اللہ وحُسن الخُلق (الترمذی) یعنی اللہ کا خوف، اور انسانوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق۔ یہی کسی کام کی جانچ کا صحیح اسلامی معیار ہے۔

کسی کام کی حقیقت کو جاننا ہو تو یہ دیکھے کہ اس سے وابستہ لوگوں کے اندر کس قسم کا مزاج پیدا ہو رہا ہے۔ اگر ان کے اندر خدا سے خوف اور انسانیتِ عامہ کے ساتھ خیر خواہی کا مزاج بن رہا ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ صحیح اسلامی کام ہے۔ اور اگر اس کے ذریعے فخر، نمائش، کبر، اظہار برتری، خود غرضی اور غیر سنجیدگی جیسا مزاج بنتا ہو تو سمجھ لیجیے کہ یہ قومی کام ہے نہ کہ اسلامی کام۔

یہاں ایک سبق آموز واقعہ قابلِ ذکر ہے جو ایک قاری الرسالہ کے ساتھ پیش آیا۔ اس قاری الرسالہ کی شادی ایک دینی گھرانے میں ہوئی۔ مگر یہاں ایک بہت بڑا مسئلہ موجود تھا۔ خاتون کے بڑے بھائی نے اپنی پسند کے مطابق، ایک ماڈرن لڑکی سے شادی کر لی۔

یہ لڑکی جب گھر میں بہو کی حیثیت سے آئی تو گھر میں سنگین مسائل پیدا ہو گئے۔ کیوں کہ گھر کا رہن سہن روایتی انداز کا تھا، اور یہ لڑکی ماڈرن انداز میں رہنا چاہتی تھی۔ اِس اختلاف کے نتیجے میں بہت سے سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ گھر میں بول چال بند ہو گئی اور مذکورہ بھائی اپنی بیوی کو لے کر الگ رہنے لگے۔

بھائی کو کسی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ سارا جھگڑا میری بہن نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بہن سے بولنا چھوڑ دیا۔ اس معاملے میں وہ اتنا زیادہ سخت ہو گیے کہ جب بہن کا نکاح ہوا اور وہ رخصت ہو کر اپنے گھر گئیں تو بھائی رخصتی کے وقت بھی ان سے ملنے کے لیے نہیں آئے۔ تعلقات میں بگاڑ کا یہ ماحول پورے سات سال تک جاری رہا۔

اس اثناء میں بہت سے علماء نے یہ کوشش کی کہ دونوں کے درمیان صلح ہو جائے، اور جھگڑا ختم ہو جائے۔ مگر صلح نہ ہو سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ علماء دو طرفہ بنیاد پر صلح کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ

فریقین سے کہتے تھے کہ ماضی کو بھلا دیجئے اور اچھے رشتے دار کی طرح باہمی تعلق قائم کرکے زندگی گذاریے۔ لیکن اس قسم کا وعظ فریقین کے لیے کسی طرح نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا تھا۔

آخر کار الرسالہ کے مذکورہ قاری نے الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا۔ اِس مضمون میں قرآن کی روشنی میں، بتایا گیا تھا کہ نزاعی معاملات کبھی دوطرفہ بنیاد پر حل نہیں ہوتے۔ ان کو حل کرنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ ایک فریق اپنی غلطی کا اعتراف کرکے دوسرے فریق سے معافی مانگ لے۔ یہی یک طرفہ اعتراف اِس طرح کے معاملے میں واحد مؤثر حل ہے۔

اِس کے بعد مذکورہ قاری الرسالہ نے معاملے پَر ازسرِ نو غور کیا۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم اِس طریقے کا تجربہ کرو۔ چناں چہ بیوی نے اپنے بھائی کے نام ایک خط لکھا۔ اِس خط میں انھوں نے یک طرفہ طور پر کھُلے انداز میں خود اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور بھائی سے کہا کہ میں مانتی ہوں کہ ساری صرف غلطی صرف میری تھی۔ اب میں آپ سے معافی مانگتی ہوں، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ اِس سلسلے میں سارا قصور میرا ہے۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ میری ہی بدقسمتی تھی کہ میں رخصتی کے وقت بھی آپ سے مل کر آپ کی دعا نہ لے سکی۔

بہن کا یہ خط جب بھائی کے پاس پہنچا تو اس کو پڑھنے کے بعد اچانک ساری برف پگھل گئی۔ بھائی اور ان کی بیوی دونوں نے اس خط کو پڑھا اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ خط میں اگرچہ بہن نے اپنے آپ کو غلط بتایا تھا لیکن جب دل بدلے تو بھائی اور ان کی بیوی دونوں کو محسوس ہوا کہ غلطی دراصل انھیں کی تھیں۔

اس کے بعد بھائی نے نہایت محبت کے انداز میں اپنی بہن کو خط لکھا اور کہا کہ تمہارے خط کے بعد ہمارے دل کا تمام غبار دھل گیا ہے۔ اب میرے دل میں تمھارے لیے وہی محبت ہے جو ایک بھائی کے دل میں اپنی بہن کے لیے ہونا چاہیے۔ اِسی کے ساتھ بھائی نے اپنی بہن کے لیے تحفے تحائف بھی بھیجے۔ انھوں نے اپنی بہن سے فون پر تفصیلی بات چیت کی، اور رو رو کر گہرے جذبات کے ساتھ معافی اور ندامت کا اظہار کیا۔ اب دونوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہوگیے ہیں۔

ناگپور میں ایک قابلِ ذکر نام مسٹر عبدالسلام چاؤس کا ہے۔ انھوں نے طویل محنت کے بعد ایک بڑا کام کیا ہے۔ وہ یہ ہے— مرہٹی جاننے والوں کے لئے انگریزی زبان میں کتابیں تیار کرنا۔ ان کی کتابیں طلبہ نیز عوام میں کافی مقبول ہیں۔ ان کی کوششوں سے اب ان کا یہ کام انسٹی ٹیوشن کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ان کی مثال بتاتی ہے کہ کس طرح ایک شخص اپنی محنت سے بڑے بڑے کام کرسکتا ہے۔ حال میں انھوں نے مراٹھی–انگریزی ڈکشنری تیار کی ہے۔ ۵۰۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا نام یہ ہے: چاؤس مراٹھی–انگریزی ڈکشنری :चाऊस मराठी–इंग्रेजी डिक्श्नरी

ناگپور، بمبئی کے بعد مہاراشٹر کا دوسرا اہم شہر ہے۔ اِس علاقے کو ۱۹۴۷ سے پہلے سنٹرل پراونس (مرکزی صوبہ) کہا جاتا تھا۔ پچھلے دس برسوں میں یہاں ڈیولپمینٹ کا کام بہت زیادہ ہوا ہے۔ اس سفر کے دوران مجھے ناگپور میں تقریباً بیس گھنٹے کا وقت گذارنے کا موقع ملا۔

ناگپور میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک مسٹر عبدالسلام چاؤس (پیدائش ۱۹۷۰) تھے۔ اُن کی زندگی میں مجھے ایک بڑا سبق نظر آیا۔

وہ مہاراشٹر کے ایک گاؤں میں ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی بظاہر کسی غیر معمولی واقعے سے خالی تھی۔ انھوں نے ناندیڑ کے ایک کالج سے بی۔ ایس۔ سی۔ کیا۔ اس کے بعد کچھ ایسے ناخوشگوار اسباب پیش آئے کہ انھیں اپنے گھر سے الگ ہوجانا پڑا۔

تقریباً آٹھ سال وہ اپنے گھر سے پوری طرح بے تعلق رہے۔ بے تعلقی کی یہ مدت ان کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ ان کے مشکل حالات نے ان کے اندر عمل کا جذبہ جگایا۔ بظاہر ایک زیرو انسان اپنی کوشش سے ایک ہیرو انسان بن گیا۔

مسٹر عبدالسلام چاؤس نے مراٹھی اور انگلش زبان میں درسی کتابوں کو اپنا خصوصی میدان بنایا۔ انھوں نے اِس سلسلے میں کئی بڑی بڑی کتابیں لکھیں، جو پورے مہاراشٹر میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کی تازہ کتاب مراٹھی–انگلش ڈکشنری ہے۔ اس کا نام چاؤس ڈکشنری ہے۔

بمبئی کے ایک بڑے گجراتی بک سیلر نے کہا کہ ''چاؤس'' کا نام اب بک ٹریڈ میں ایک برانڈ

بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کی تازہ کتاب (چاؤس ڈکشنری) مارکیٹ میں آئی تو لوگوں نے صرف ٹائٹل دیکھ کر اس کو خرید لیا۔ ان کو یقین تھا کہ جس کتاب کا آتھر چاؤس ہے وہ یقیناً اچھی کتاب ہوگی۔

مسٹر عبدالسلام چاؤس کے بھائی عبدالرحمٰن چاؤس (پیدائش ۱۹۷۵) انٹرنیشنل بک فئر کے تحت دہلی آئے۔ وہ اِس بک بزنس میں اپنے بھائی کے ساتھ پوری طرح شریک ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ اب ''چاؤس برادرس'' کے نام سے ہر جگہ مشہور ہوگیے ہیں۔ چاؤس کا نام اب عزّت کا ایک نام بن گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے بتائے ہوئے اصول ''دینے والے بنو'' کا کرشمہ ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں اس کا عملی تجربہ کیا ہے۔ مراٹھی اسپیکنگ لوگوں کو ہم نے ایسی کتابیں دیں جو اُن کی ضرورت تھیں لیکن وہ مارکیٹ میں موجود نہ تھیں۔ چنانچہ اِن کتابوں کی عمومی مقبولیت کی راہ میں کوئی فرقہ وارانہ تعصّب حائل نہیں ہوا۔ ''چاؤس بردس'' کو برابر اعتراف کے خطوط ملتے رہتے ہیں۔ حال میں ایک ہندو نے ان کی ایک کتاب کے بارے میں اپنے خط میں لکھا:

This is the thing we wanted most.

یہ لوگ اپنی کتابوں کے اشتہار انگریزی اور مراٹھی اخبارات میں دیتے ہیں۔ یہ تمام اخبارات ہندو لوگوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا معاملہ حد درجہ کو آپریٹیو ہوتا ہے۔ مثلاً مسٹر بال ٹھاکرے کا مراٹھی اخبار ''سامنا'' ایک ڈیلی اخبار ہے۔ اس میں ان کی کتابوں کے اشتہار چھپے ہیں۔ سامنا والوں نے ان کی اتنی زیادہ قدردانی کی کہ بہت زیادہ رعایتی ریٹ پَر اُن کے اشتہارات چھاپنے لگے۔ عام مسلمان بال ٹھاکرے کو بطور خود مسلم دشمن سمجھتے ہیش۔ مگر چاؤس بردرس کے لیے وہ ایک بہترین دوست بن گیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ ہماری اپنی جھوٹی سوچ کسی کو اپنا دشمن سمجھ لیتی ہے۔ یہ لوگ مہاراشٹر کے انگریزی، مراٹھی اور ہندی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہار دیتے ہیں۔ ان کی بزنس کا بہت بڑا انحصار ان اخبارات پر ہے۔ اِن تمام اخبارات کے مالک ہندو ہیں۔ مگر وہ ان لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ رعایت کا معاملہ کرتے ہیں۔

ناگپور میں میری ملاقات مسٹر عبدالسلام چاؤس سے ہوئی تو میں سب سے زیادہ متاثر ان کی سادگی سے ہوا۔ میں ان کے گھر پر بھی گیا۔ لیکن میں نے پایا کہ ان کی پوری زندگی حد درجہ سادی کی زندگی ہے۔ مثلاً وہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے بڑی گاڑی رکھ سکتے ہیں لیکن وہ ابھی تک ماروتی کی چھوٹی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ اِسی طرح ان کی پوری زندگی سادگی پر مبنی ہے۔ آمدنی کی نسبت سے ان کی سادہ زندگی ایک انوکھا نمونہ ہے۔

سادگی کا اصول انسان کی ترقی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سادگی، آدمی کو اِس قابل بناتی ہے کہ اس کی نظر اصل نشانے سے ہٹنے نہ پائے۔ اس کا وقت اور اس کا پیسہ اور اس کی توجہ سب کا سب صرف ایک چیز پر خرچ ہو، اور وہ اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ مسٹر عبدالرحمٰن چاؤس نے اِس سلسلے میں کہا— بامقصد انسان ہمیشہ ایک قناعت پسند انسان ہوتا ہے۔ جس آدمی کے سامنے ایک مقصد ہو وہ دنیوی چیزوں کے معاملے میں ضرورت پر قناعت کر لیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ سادگی کسی بھی انسان کی ترقی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ایک مقولہ ہے کہ— سادہ زندگی اور اونچی سوچ (Simple living, high thinking)۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو زیادہ بامعنی طور پر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ— سادہ زندگی اور بڑی ترقی:

Simple living, high success.

قدیم زمانے میں سادہ زندگی ایک عام چیز تھی۔ مگر موجودہ زمانے میں سادہ زندگی کے لیے سخت قسم کی شعوری جدوجہد درکار ہے۔ اِس اعتبار سے موجودہ زمانے کا سب سے بڑا فتنہ کنزیومرازم (cunsumerism) ہے۔ قدیم ڈکشنری میں یہ لفظ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ آج کنزیومرازم نے ایک عمومی فتنے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر عورت اور مرد اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ لوگوں کی آمدنی کا بڑا حصہ کنزیومر گڈس (consumer-goods) کو حاصل کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ جو شخص کنزیومرازم کے اس فتنے سے اپنے کو بچا لے اس پر فانی بدایونی کا یہ شعر صادق آئے گا:

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل، اے معاذ اللہ! بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اٹھایا

اِس شعر میں آخری مصرعے کو اگر اس طرح پڑھا جائے تو وہ صورت حال کے عین مطابق ہوگا:

بڑی مشکل سے دل کو بزمِ شاپنگ سے اٹھا پایا

مسٹر عبدالسلام چاؤس کی ایک مراٹھی کتاب انگلش اسپیکنگ کے موضوع پر ہے۔ اس کتاب کا مراٹھی نام یہ ہے: انگریزی مدھیہ بولا پٹکن، یعنی انگریزی بولو فوراً۔ اِس کتاب کے ڈیڈیکشن میں انھوں نے اپنی بیوی کے بارے یہ الفاظ لکھے ہیں:

An uncommon woman, her full support which includes countless sacrifices, has made this book possible.

یہ جملہ ایک چشم کُشا جملہ ہے۔ اس میں ہر آدمی کے لیے سبق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کا رول کسی انسان کی زندگی میں فیصلہ کُن رول کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی انسان کو آپ تباہ ہوتے ہوئے دیکھیں تو یقین کر لیجئے کہ اس کی تباہی میں سب سے بڑا عامل اس کی بیوی ہے۔ اسی طرح آپ کسی انسان کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ اس کی کامیابی میں سب سے بڑا عامل اس کی بیوی ہے۔ یہ ایک ایسا عمومی اصول ہے جس میں شاید ہی کوئی استثناء ملے گا۔ میرے تجربے کے مطابق، اِس اعتبار سے کسی عورت کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ صبر کی حد تک سادہ زندگی کو اختیار کرنے والی ہو۔

اِس معاملے میں ایک رہنما مثال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں آتا ہے کہ جب آپ مدینے میں تھے تو آپ کی ازواج نے آپ سے مزید نفقے کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں بہت سے واقعات کتابوں میں بیان کیے گیے ہیں، قرآن کی سورہ نمبر ۳۳ میں اِس کا ذکر آیا ہے۔ اِس سلسلے میں متعلقہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تم کو کچھ مال ومتاع دے کر خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو تو اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے (الاحزاب: ۲۸۔۲۹)

قرآن کی اِس آیت میں ایک وقتی واقعے کے حوالے سے ایک عمومی اصول بتایا گیا ہے۔ وہ

اصول یہ ہے کہ — ایک بامقصد انسان (man of mission) پُرتکلف زندگی کا تحمّل نہیں کرسکتا۔ ایک بامقصد انسان کے لیے سادگی کسی مجبورانہ روش کا معاملہ نہیں، سادگی اس کے لیے ایک عظیم اصولِ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ بامقصد انسان کا سوچا سمجھا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنا سب کچھ مشن کی راہ میں لگانا ہے۔ ایسا آدمی ہمیشہ یہی کرے گا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں ہر پہلو سے سادگی کو اختیار کرے گا، اور اپنے مال کو صرف اپنے مشن کے فروغ میں لگائے گا۔

اِس آیت میں پیغمبر اسلام کی ازواج کو یہی حقیقت یاد دلائی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تم جس انسان کی زوجیت میں ہو وہ ایک صاحبِ مشن انسان ہے۔ وہ ساری دنیا کے لوگوں کے لیے جینے والا انسان ہے نہ کہ صرف اپنی ذات کے لیے جینے والا انسان۔ ایسی حالت میں تم کو جان لینا چاہیے کہ تم اگر رسول کی رفاقت چاہتی ہو تو تم کو سادہ زندگی پر راضی ہونا پڑے گا۔ پُر راحت زندگی اور صاحبِ مشن انسان کی رفاقت، دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۶ کو شام کی فلائٹ کے ذریعے ناگپور سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر سہارا ایر لائنز کی فلائٹ کے ذریعے ہوا۔ جیسا کہ اخباروں میں آچکا ہے، سہارا ائر لائنز اب جیٹ ایر لائنز میں شامل ہو جائے گی۔ اعلان کے مطابق، یہ شیئر ایکویزیشن سمجھوتہ ہے۔ ۵۰۰ ملین ڈالر میں حصے داری خرید کا یہ سمجھوتہ ہوا ہے۔

انڈیا میں آج کل پرائیویٹ ہوائی کمپنیاں بہت بڑھ رہی ہیں۔ مگر انڈیا میں ہوائی سفر اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک اس کو حکومت کے قبضے سے نکال کر مکمل طور پر پرائیویٹ کمپنیوں کو نہ دے دیا جائے۔ بظاہر یہ ایک مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہندستان میں تین بڑے ہوائی اڈّوں کے متعلق، یہ بات عرصے سے چل رہی ہے مگر آج تک اس کا فیصلہ نہ ہوسکا۔

جیسا کہ معلوم ہے چین ایک کمیونسٹ ملک ہونے کے باوجود بہت زیادہ ترقی کر رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اقتصادی معاملات کو پوری طرح پرائیویٹ سیکٹر میں دے دیا ہے۔ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ انڈیا میں تین بڑے ہوائی اڈوں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دینے کی تجویز ابھی تک

واقعہ نہ بن سکی۔ جب کہ چین میں ۸۰ ہوائی اڈوں کو پوری طرح پرائیویٹ سیکٹر میں دے دیا گیا ہے۔ اِس بنا پر وہاں بین اقوامی تجارت کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۶ کی شام کو ساڑھے آٹھ بجے دہلی ایر پورٹ پہنچا۔ ایئر پورٹ سے باہر آ کر جب میں گاڑی میں بیٹھا تو سعدیہ نے ایک انوکھی بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی ہوم سِک (homesick) ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ تمام لوگ پیراڈائز سِک (paradise-sick) ہیں۔

ہر عورت اور مرد اپنے دل میں پَیراڈائز کی یاد لیے ہوئے ہیں۔ وطن سے دوری کا احساس جس کو لوگ عام طور پر ہوم سِک سمجھ لیتے ہیں وہ دراصل زیادہ بڑے پیمانے پر پیراڈائز سِک ہونے کا معاملہ ہے۔ جنت کے شعور سے بے خبر ہونے کی بنا پر یہ لوگ اپنے احساس کو اپنے گھر سے جوڑ دیتے ہیں۔ اگر انھیں جنت کا شعور حاصل ہو تو وہ جان لیں گے کہ وہ دراصل پیراڈائز سِک تھے، اگر چہ انھوں نے غلطی سے اپنے آپ کو ہوم سک سمجھ لیا۔ یہ بات سعدیہ نے انگریزی میں کہی تھی میں نے اس کو یہاں اردو میں منتقل کر کے لکھا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$10/£5
دو سال	Rs. 200	$20/£10
تین سال	Rs. 250	$30/£15